Marfat.com

2922

منہاج العرفان فی لفظ القرآن

طاہر

(لفظِ قرآن کے معانی و معارف)

پروفیسر محمد طاہر القادری

مرکزی ادارہ منہاج القرآن

۳۶۵-ایم ماڈل ٹاؤن۔لاہور

Marfat.com

ذخیرہ صاحبزادہ میاں جمیل احمد شرقپوری نقشبندی مجددی

جو 2001ء میں میاں صاحب نے
پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو عطا فرمایا

جملہ حقوق بحق ———— 85943

~~68443~~

نام کتاب ———— مناہج العرفان فی لفظ القرآن
تصنیف ———— پروفیسر محمد طاہر القادری
اشاعت اوّل ———— جنوری ۱۹۸۶ء
تعداد ———— چار ہزار
مطبع ———— اردو آرٹ پریس - لاہور
قیمت ————
Rs 1800

نوٹ

پروفیسر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور خطبات کی ریکارڈ شدہ کیسٹوں کی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے مرکزی ادارہ منہاج القرآن کے لیے وقف ہے۔

Marfat.com

2722

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمِ

مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْکَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ

وَالْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم

Marfat.com

نوٹ

کتاب ہذا مفکرِ اسلام، نابغۂ عصر پروفیسر محمد طاہر القادری
کی زیرِ تالیف تفسیر "منہاج القرآن" کے مقدمہ کے
ایک مبحث "لفظِ قرآن کے معانی و معارف" پر مشتمل
ہے ——— تفسیر کی پہلی جلد انشاء اللہ عنقریب ،
——— منظرِ عام پر آجائے گی ———

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قرآن، اپنے نفسِ مضمون کے علاوہ عنوان کے اعتبار سے بھی تمام کتب وصحائف پر نمایاں فوقیت و امتیاز کا حامل ہے۔ علماء و مفسرین نے قرآن کے متعدد صفاتی اسماء بیان کیے ہیں۔ جن کا ذکر بنیادی طور پر خود قرآنِ مجید کے مختلف مقامات پر آیا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں علامہ ابو المعالیؒ اپنی کتاب "البرہان" میں فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی مختلف خوبیوں اور خصائص کے پیشِ نظر اس کے پچپن (۵۵) نام بیان فرمائے ہیں۔ مثلاً الفرقان، الذکر، الکلام، الکتاب، النور، الھدیٰ، الشفاء، الموعظۃ، الحکمۃ البالغۃ، الرحمۃ، احسن الحدیث، التنزیل، التذکرۃ، العروۃ الوثقیٰ، البلاغ، الصحف القیمۃ، البیان وغیرہا یہ سب مترادفات ہیں جو قرآنِ حکیم کی گوناگوں خصوصیات کے پیشِ نظر اس میں موقع ومحل کے اعتبار سے استعمال ہوئے ہیں لیکن قرآن کا ذاتی نام جس سے اس مقدس کتاب کو تخصیص اور تشخص حاصل ہے۔ وہ "القرآن" ہے۔

اصطلاحِ قرآن کا الہامی ہونا

لفظِ "قرآن" خود قرآنِ مجید میں کم وبیش ستر مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ یہ بھی اس کی انفرادیت اور امتیاز کا ایک پہلو ہے کہ جتنی بھی آسمانی کتابیں بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے لیے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئیں وہ محرف ومتبدل صورت میں جس قوم کے پاس بھی ہیں ان میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں جو اس وقت اپنے نام کی خود نشاندہی کرتی ہو۔

تورات جس کا موجودہ نام خمسۂ موسوی ہے اور جو بائبل کی پہلی پانچ کتابوں پر مشتمل ہے کا مطالعہ فرمایئے یا اناجیل اربعہ کا ان میں کوئی ایک مقام بھی ایسا نہیں ہے جس سے ان کے اصل ناموں کا پتہ چل سکے۔ یہی حال زبور کا ہے۔ دیگر انبیاء کی کتابیں اور صحیفے بھی اسی بائیبل (کتابِ مقدس) میں موجود ہیں جس کے دو حصے ہیں۔

"عہد نامہ قدیم" اور "عہد نامہ جدید"

اس پوری کتاب میں بھی ایسا کوئی ذکر نہیں جس سے اس کے نام کی نشاندہی ہوتی ہو۔ لیکن اس کے برعکس یہ عظیم امتیاز اس کلامِ الٰہی کو حاصل ہے جو تاجدارِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا کہ یہ ازخود اپنے نام کی ستر مرتبہ نشاندہی کرتا ہے۔

چند مقامات ملاحظہ ہوں۔

Marfat.com

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ (الواقعہ: ۷۷) — بے شک یہ بزرگی والا قرآن ہے۔

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيدٌ (البروج: ۲۱) — بلکہ وہ قرآنِ مجید ہے۔

أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَذَا الْقُرْآنَ (یوسف: ۳) — ہم نے آپ کی طرف یہ قرآن نازل کیا۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ (البقرہ: ۵۸) — رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ (الاسراء: ۹) — بیشک یہ قرآن اس راہ کی ہدایت دیتا ہے جو سب سے سیدھی ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس کلامِ پاک کا نام "القرآن" کسی اور کا مجوّزہ نہیں بلکہ منزّل من اللہ یعنی الہامی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کا نام بھی خود ہی نازل فرمایا ہے تو بہرصورت اس نام کی کوئی نہ کوئی نمایاں خصوصیت اور اہمیت ہونی چاہیئے۔

یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ نام کی حیثیت ایسے عنوان کی ہوتی ہے جس سے مضمون کے مشمولات (CONTENTS) کا ایک ہی نظر سے پتہ چل جاتا ہے۔ عنوان جامع ومانع ہو تو وہ مضمون کے مشمولات پر ضرور دلالت کرتا ہے۔ اس عنوان ہی کو دیکھ کر مضمون کی اصل افادیت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ عنوان اور مضمون کا یہی تعلق اسم اور مسمّٰی کے درمیان بھی موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ اسم سے مسمّٰی کے خصائص، تاثیرات، کمالات اور حالات کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہوجاتا ہے۔ باری تعالیٰ نے بھی اپنی کتاب کا نام اور مضمونِ کلام کا عنوان خود اس لیے متعین فرمادیا کہ اس کے ذریعے انسانوں کو اس کتاب کے نفسِ مضمون کی عظمت و اہمیّت کا خود بخود اندازہ ہوجائے۔ یہ مقصد اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے تجویز کردہ نام کے ذریعے اس حُسن وخوبی سے انجام نہیں پاسکتا تھا۔

لفظِ قرآن کا لُغوی معنیٰ

ہر چند کہ کسی لفظ کے محض لُغوی معنیٰ سے اس کی کامل معرفت حاصل نہیں ہوسکتی لیکن کسی لفظ کی صحیح معرفت کے لیے اس کے لُغوی مفہوم کو نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اسلئے کہ لغوی مفہوم کا تعلق اس لفظ کے مادے (ORIGIN) کے ساتھ ہوتا ہے اور اسی مادے پر مصدر اور تمام مشتقات کے معانی کا انحصار ہوتا ہے۔ جتنے بھی لفظ اس مادے سے نکلتے ہیں، ہر ایک میں اسی مادے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ مثلاً معلوم، معلّم، متعلّم، تعلیم اور تعلّم وغیرہ تمام مشتقات میں علم کا ہی مفہوم موجود ہے۔ اسلیے کسی بھی لفظ کے اصل مفہوم کی صحیح معرفت کے لیے اس کے لُغوی اشتقاق کا علم نہایت مفید ثابت ہوتا ہے۔

لفظِ قرآن کے لُغوی معنیٰ کے سلسلے میں علماء کرام کے دو مؤقف ہیں۔ امام شافعیؒ اور امام جلال الدین سیوطیؒ کا مؤقف یہ ہے کہ لفظِ قرآن "غیر مشتق" ہے۔ تورات اور انجیل کی طرح "القرآن" بھی ایسا اسمِ علَم ہے جو کسی اور لفظ یا مادے سے ماخوذ نہیں، لیکن علماء محققین کی اکثریت کا خیال یہ ہے کہ لفظِ قرآن

Marfat.com

متفق ہے۔ علماءِ لغت نے اس کے مختلف مادے بیان کیے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں :۔

۱۔ قَرَأَ ۲۔ قَرَنَ
۳۔ قِرْأَۃٌ ۴۔ قرائن

لفظِ قرآن کا پہلا مادۂ اشتقاق۔ قَرَءَ لفظِ قرآن کا پہلا مادۂ اشتقاق قَرَءَ ہے جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ عربی زبان میں کہا جاتا ہے :۔

قَرَأَ الْمَاءَ فِي الْحَوْضِ اس نے حوض میں پانی جمع کیا۔

اس لحاظ سے "قرآن" کے دو معنیٰ قرار پاتے ہیں :۔

۱۔ وہ کتاب جسے جمع کیا گیا۔
۲۔ وہ کتاب جس کے اندر سب کچھ جمع کر دیا گیا۔

پہلی معنوی دلالت پہلے معنی کے اعتبار سے لفظِ قرآن اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اس کتاب کا جمع کیا جانا بھی امرِ الٰہی کے تحت اور الہامی ہدایت کے مطابق ہوگا۔ اس کی شہادت ہمیں قرآن کے حکم سے اس طرح ملتی ہے :۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ بے شک اس کتاب کا جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمے ہے۔ (القیٰمہ، ۱۷)

اس لحاظ سے لفظِ قرآن "مجموع" کے معنیٰ میں تصور ہوگا۔ جس سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ قرآن کی جمع و تدوین اور ترتیب سب کچھ الہامی ہے۔ اس میں کسی فرد کی ذاتی رائے یا استصواب کا قطعاً کوئی دخل نہیں۔ اس لیے اصطلاحِ شرع میں "قرآن اس منزل من اللہ معیّن مجموعے کو کہا جاتا ہے جو کتابی صورت میں موجود ہے" مولانا عبدالحق شارح حسامی لکھتے ہیں :۔

وَفِي عُرْفِ الشَّرْعِ عَلَى الْمَجْمُوعِ الْمُعَيَّنِ الْمُنَزَّلِ عَلَى الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (نامی شرحِ حسامی ص۵)

اور لفظِ قرآن کا استعمال عرفِ شرع میں اس مجموعِ معیّن پر ہوتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا۔

لفظِ قرآن کے پہلے معنی نے اس کتاب کی جمع و تدوین کی نسبت عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر عہدِ عثمانی تک کی گئی تمام کوششوں اور کاوشوں کی صحت و حقانیت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ گویا یہ ہدایاتِ ربانی کا ایسا مجموعہ ہے جو نزول کے وقت سے لے کر قیامت تک صحیح حالت میں محفوظ رہے گا۔ کیونکہ اس کا مجموعہ ہونا بھی الہامی حفاظت کے تحت ہے۔ اس لیے نہ کوئی اس میں رد و بدل کر سکا اور نہ کر سکے گا۔

دوسری معنوی دلالت دوسرے معنیٰ کے اعتبار سے لفظِ قرآن اس امر پر دلالت کرتا ہے

Marfat.com

کہ اس کتاب کو "جامعیت" کا شرف حاصل ہے۔ زجاج اس قول کی تائید کرتے ہیں۔ علامہ زرکشی "البرہان فی علوم القرآن" میں اسی معنیٰ کو نقل فرماتے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں عورت کی عدّت کے بارے میں حکم ہے۔ "یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ" لفظِ قُرُوْء قُرْءٌ کی جمع ہے جو حیض (اور شوافع کے نزدیک طہر) کے لیے استعمال ہوا ہے۔ "عورتیں طلاق کی صورت میں تین حیض تک انتظار کریں۔ اس کے بعد نکاح ثانی کر سکتی ہیں"۔

بہرحال قرء کا اطلاق ایامِ حیض پر ہو یا طہر پر۔ یہ رحم میں خون کے جمع ہونے یا جمع شدہ خون کے جاری ہونے پر استعارہ ہے۔ چونکہ "قرء" میں بنیادی طور پر کسی شے کے جمع ہونے کا معنی موجود ہے اس لیے اس مادے کی بناء پر قرآن کے لفظ میں بھی جامعیت اور ہمہ گیریت (COLLECTION AND COMPREHENSION) کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جو اس کتاب کے جامع اور محیط ہونے پر دلالت کرتا ہے گویا یہ وہ کتاب ہے جو ہر شے کا علم اپنے اندر جمع کیے ہوئے ہے اور تمام علوم و معارف پر حاوی اور محیط ہے۔ اس معنیٰ کی تصدیق و تائید خود قرآنِ حکیم کے متعدد مقامات سے ہوتی ہے۔ قرآن اس لیے جامع ہے کہ اس میں جملہ حقائقِ کائنات اور تمام اقسام کے علوم و معارف اللہ تعالیٰ نے جمع کر دیئے ہیں۔ امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں :۔

تَسْمِيَةُ هٰذَا الْكِتَابِ قُرْآنًا مِنْ بَيْنِ كُتُبِ اللهِ لِكَوْنِهٖ جَامِعًا لِثَمَرَةِ كُتُبِهٖ بَلْ لِجَمْعِهٖ ثَمَرَةَ جَمِيْعِ الْعُلُوْمِ (المفردات)

اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابوں میں سے اس کو قرآن کہنا اس وجہ سے ہے کہ خدا کی نازل کردہ ساری کتابوں کے ثمرات و مطالب اس میں جمع ہیں۔ جبکہ یہ تمام علوم و معارف کی بھی جامع ہے۔

قرآن کی جامعیت جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو اوّل سے آخر تک اصلاً تمام حقائق و معارف اور جملہ علوم و فنون کی جامع ہے۔ قرآن خود کئی مقامات پر اس حقیقت کی تائید کرتا ہے ارشادِ باری تعالیٰ ہے :۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل : ۸۹)

اے محبوب! ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی ہے جو ہر شے کا تفصیل بیان کرنے والی ہے۔

شَیْءٌ کے لفظ کا اطلاق کائنات کے ہر وجود پر ہوتا ہے۔ خواہ وہ مادی ہو یا غیر مادی۔ جو چیز بھی ربِ ذوالجلال کی تخلیق ہے "شی" کہلاتی ہے اور ہر شے کا تفصیلی بیان قرآن کے دامن میں ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے :۔

وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ (یوسف : ۱۱۱)

قرآن ہر شے کی تفصیل بیان کرتا ہے

ایک اور مقام پر ارشاد ہے :۔

Marfat.com

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام، ۳۸)

اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ ہم نے اپنی تخلیق کردہ کوئی چیز ایسی نہیں چھوڑی جس کی تفصیل قرآن میں نہ ہو۔

چونکہ ازل سے ابد تک جملہ حقائق اور ماکان و مایکون کے جمیع علوم قرآنِ مجید میں موجود ہیں۔ اس لیے اس حقیقت کو اس انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (الانعام، ۵۹)

اس کائنات میں کوئی خشک و تر چیز ایسی نہیں جس کا بیان کلامِ پاک میں موجود نہ ہو۔

اس آیت میں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں :۔

رطب اور یابس ، رطب کا معنی تر ہے اور یابس کا خشک ، یہ آیت قرآنی ایجاز اور فصاحت و بلاغت کی دلیلِ اتم ہے۔ کیونکہ کائناتِ ارض و سما کا کوئی وجود اور کوئی ذرہ ایسا نہیں جو خشک یا تر یا دونوں حالتوں سے خارج ہو۔ بحر و بر، شجر و حجر، زمین و آسماں، جمادات و نباتات، جن و انس، خاکی ذرات اور آبی قطرات، حیوانات اور دیگر مخلوقات الغرض عالمِ پست و بالا کی جس شے کا بھی تصور کر لیجیے۔ وہ یا تو خشک ہوگی یا تر، یا دونوں حالتوں کا مرکب ہوگی، قرآن نے صرف دو لفظ لا رطبٍ وّلا یابسٍ استعمال کر کے درحقیقت ساری کائنات کے ایک ایک ذرّے کا بیان کر دیا کہ اس کا علم قرآن میں موجود ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے :۔

وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيْلًا (بنی اسرائیل، ۱۲)

اور ہم نے قرآن میں ہر چیز کا الگ الگ مفصل بیان کیا ہے۔

علامہ ابنِ برہان اسی کی تائید میں فرماتے ہیں کہ :۔

مَا مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ فِي الْقُرْاٰنِ اَوْ فِيْهِ اَصْلُهٗ (الاتقان، ۲ : ۱۲۶)

کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں جس کا ذکر یا اس کی اصل قرآن سے ثابت نہ ہو۔

گویا قرآن میں یا تو ہر چیز کا ذکر صراحت کے ساتھ ملے گا یا اس کی اصل ضرور موجود ہوگی۔ یہ بات لوگوں کی اپنی اپنی استعداد و صلاحیت، فہم و بصیرت اور قوتِ استنباط و استخراج کے پیشِ نظر کہی گئی ہے۔ کیونکہ ہر کوئی، ہر شے کی تفصیل قرآن سے اخذ کرنے کی استعداد نہیں رکھتا۔

اگر قدرت کی طرف سے کسی کو نورِ بصیرت حاصل ہو، انشراحِ صدر ہو چکا ہو، حجابات اُٹھ چکے ہوں اور ربِ ذوالجلال نے اس کے سینے کو قرآنی معارف کا اہل بنا دیا ہو تو اسے ہر شے کا تفصیلی بیان بھی نظر آجائے گا۔

اسی موقع پر امام سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ اصلاً ذکر کا معنیٰ یہ ہے :۔

Marfat.com

مَا مِنْ شَیْءٍ اِلَّا یُمْکِنُ اِسْتِخْرَاجُہٗ مِنَ الْقُرْآنِ لِمَنْ فَھَّمَہُ اللّٰہُ

(الاتقان، ۲: ۱۲۶)

کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کا استخراج و استنباط آپ قرآن سے نہ کر سکیں۔ لیکن یہ علوم و معارف اسی پر آشکار ہوتے ہیں جس کو ربِ ذوالجلال خصوصی فہم سے بہرہ ور فرما دیں۔

حضرت عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ جلیل القدر صحابی ہیں جن کو حضور علیہ السلام نے ترجمان القرآن کے لقب سے سرفراز فرمایا تھا اور ان کے بارے میں جبرئیلِ امین نے یہ خوشخبری بھی دی تھی :۔

اِنَّہٗ کَائِنٌ حَبْرُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اس اُمت کے سب سے بڑے عالم ہیں۔

آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :۔

لَوْ ضَاعَ لِیْ عِقَالُ بَعِیْرٍ لَوَجَدْتُہٗ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ

(الاتقان : ۲، ۱۲۶)

(صحبتِ نبوی کے فیضان سے مجھے قرآن کی اسقدر معرفت حاصل ہو چکی ہے کہ میرے اونٹ کی رسی بھی گم ہو جائے تو قرآن کے ذریعے تلاش کر لیتا ہوں۔

اُونٹ کی رسی کا گم ہونا کتنا معمولی واقعہ ہے۔ لیکن اہلِ بصیرت ایسا معمولی سے معمولی واقعہ اور حادثہ بھی قرآن سے معلوم کر لیتے ہیں۔ محقق ابنِ سراقہ "کتاب الاعجاز" میں جامعیتِ قرآن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

مَا مِنْ شَیْءٍ فِی الْعَالَمِ اِلَّا وَ ھُوَ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ

کائنات میں کوئی شے ایسی نہیں جس کا ذکر قرآن میں موجود نہ ہو۔

(الاتقان: ۲، ۱۲۶)

اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کوئی شے قرآن میں مذکور نہ ہو تو وہ کائنات میں موجود نہیں ہو سکتی۔ گویا قرآن میں کسی چیز کا مذکور نہ ہونا کائنات میں اس کے موجود نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا قرآن کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ اس میں کسی چیز کے ذکر یا عدمِ ذکر کو کائنات میں اس کے وجود و عدم کی دلیل تصور کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے جامعیتِ قرآن کی نسبت یہ دعویٰ کیا :۔

سلونی عما شئتم اخبرکم عنہ فی کتاب اللہ

جس چیز کی نسبت چاہو مجھ سے پوچھ لو، میں تمہیں اس کا جواب قرآن سے دوں گا۔

(الاتقان : ۲، ۱۲۶)

Marfat.com

آپؒ نے حضرت سعید بن جبیرؒ کا یہ قول بھی اپنی کتاب "الام" میں نقل فرمایا ہے :۔

مابلغنی حدیث عن رسول اللہ علی وجھہ الّا وجدت مصداقہ فی کتاب اللہ (ایضاً)

آج تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث مجھے ایسی نہیں ملی جس کا واضح مصداق میں نے قرآن مجید میں نہ پایا ہو۔

تمام آسمانی کتابوں کے ثمرات و مطالب اور علوم و معارف کی جامع بھی یہی کتاب ہے ۔امام بیہقیؒ حضرت حسنؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سو چار کتابیں نازل فرمائیں جن میں کائنات کے تمام علوم و معارف بیان کر دیئے ۔ پھر ان تمام علوم کو چار کتابوں (تورات، زبور، انجیل اور قرآن) میں جمع کر دیا۔ پھر ان میں سے پہلی تین کتابوں کے تمام معارف کو قرآنِ حکیم میں جمع فرمایا اور اس طرح یہ قرآن ایسی جامع کتاب قرار پائی کہ ابن ابی الفضل المرسیؒ فرماتے ہیں کہ :۔

جمع القرآن علوم الاولین والاٰخرین بحیث لم یحط بھا علماً حقیقۃً الا المتکلم ثم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (الاتقان، ۲ : ۱۲۶)

اس قرآن نے اوّل سے آخر تک ابتدا سے انتہا تک کائنات کے تمام علوم و معارف کو اپنے اندر اس طرح جمع کر لیا ہے کہ فی الحقیقت خدا اور اس کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ان علوم کا احاطہ نہ کوئی آج تک کر سکا اور نہ کر سکے گا۔

چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے اس سلسلے میں مروی ہے :۔

مَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ فَعَلَیْہِ بِالْقُرْاٰنِ فَاِنَّ فِیْہِ خَبَرَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ (ایضاً)

جو شخص علم حاصل کرنا چاہے ۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن کا دامن تھام لے ۔کیونکہ اسی قرآن میں ہی اوّل سے آخر تک سارا علم موجود ہے۔

تمام ظاہری و باطنی علوم و معارف کا جامع ہونا ، تمام موجوداتِ عالم کے احوال کا جامع ہونا اور تمام آسمانی کتابوں کے ثمرات و مطالب کا جامع ہونا ، یہ وہ نمایاں خصوصیات تھیں جن کے باعث اس مقدس کتاب کا نام اللہ تعالیٰ نے "اَلْقُرْاٰنُ" رکھا ہے۔

جامعیتِ قرآن کی عملی شہادتیں

پہلی شہادت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی (۶۳ برس) عمر مبارک کا قرآن سے استشہاد :

امام جلال الدین سیوطی "الاتقان" میں اس ضمن میں یہ آیت نقل کرتے ہیں۔

وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُھَا (المنافقون : ۱۱)

جب کسی کی اجل آجائے تو اللہ تعالیٰ ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں فرماتے۔

Marfat.com

قرآنِ کریم کی اس آیت کا اطلاق عمومی ہر انسان کی موت پر ہے لیکن اہلِ علم و بصیرت جانتے ہیں کہ اس کے نزول کے وقت اس میں وصالِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا تھا۔

یہ آیت "سورۃ المنافقون" (جو قرآنِ مجید کی ترسٹھویں (۶۳) سورۃ ہے) کی آخری آیت ہے۔ جس کے بعد رب ذوالجلال نے "سورۂ تغابن" کو منتخب فرمایا۔ تغابن "ناپید ہو جانے اور ہست سے نیست ہو جانے" کو کہتے ہیں۔ ۶۳ ویں سورت کے اختتام پر کسی پر وقتِ اجل کے آجانے کا ذکر اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ حضور علیہ السلام کی ظاہری عمرِ مبارک ۶۳ ویں برس پر اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی اور اس آیت کے فوراً بعد سورۂ تغابن کا انتخاب مزید صراحت کے لیے تھا کہ اب اس ہستی مبارک کی حیاتِ ظاہری کے ناپید ہو جانے کے بعد انعقادِ قیامت کا ہی دَور آئے گا۔ درمیان میں کسی اور نبی یا اُمت کا دَور ممکن نہیں۔ یعنی حضور علیہ السلام کا دورِ نبوّت، روزِ قیامت سے متصل ہے درمیانی سارے عرصے کو یہی محیط ہے۔ کسی اور کا زمانہ باقی نہیں رہا۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام نے خود اپنی درمیان والی انگلی اور انگشتِ شہادت کو ملا کر فرمایا تھا:۔

انا والساعۃ کھاتین — میں (یعنی میرا دَور) اور قیامت دونوں آپس میں ان دو انگلیوں کی طرح متصل ہیں۔

جیسے ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں۔ اسی طرح میرے دورِ نبوّت اور قیامت کے درمیان کوئی فاصلہ یا زمانہ نہیں۔ گویا یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمرِ مبارک کے تعین کے ساتھ ساتھ آپ کے ختمِ نبوّت کے اعلان پر بھی مشتمل ہے۔ اس شہادت سے "قرآن" کی شانِ جامعیت پر روشنی پڑتی ہے۔

دوسری شہادت | امام غزالیؒ سے ایک غیر مسلم نے سوال کیا کہ اجرامِ فلکی یعنی سُورج، چاند اور دیگر سیارگان فضا میں جو حرکت کرتے ہیں وہ دو طرح کی ہے۔ ایک سیدھی اور دوسری معکوس! مثلاً مشرق سے مغرب کی طرف اور پھر مغرب سے مشرق کی طرف۔ قرآنِ مجید میں ایک کا ذکر تو موجود ہے لیکن دوسری کا کہاں ہے؟ اس پر امام غزالیؒ نے اس شخص سے پوچھا کہ پہلی حرکت کا ذکر کس آیت میں ہے؟ اس نے یہ آیت پڑھی:۔

كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ — سارے سیارے (فضا میں) تیرتے رہتے ہیں۔ یعنی حرکت پذیر رہتے ہیں۔ (یٰسین، ۴۰)

امام غزالیؒ نے فرمایا۔ اسی آیت میں ان کی حرکتِ معکوس کا ذکر بھی ہے۔ اگر "كُلٌّ فِي فَلَكٍ" کے الفاظ کو اُلٹا کر کے یعنی معکوس طریقے سے پڑھا جائے۔ یعنی فَلَکٍ کی کَ سے شروع کر کے کُلٌّ کی کَ تک

Marfat.com

پڑھا جائے تو پھر بھی "كُلٌّ فِي فَلَكٍ" ہی بنے گا۔ گویا آیت کے اس حصہ کو سیدھی سمت میں پڑھنے سے سیارگانِ فلکی کی سیدھی حرکت کا ذکر ہے اور معکوس سمت میں پڑھنے سے حرکتِ معکوس کا ذکر ہے۔

(كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ کو اُلٹی سمت سے پڑھیے، فَلَكٍ میں آخری حرف "ک" ہے۔ پھر "ل" ہے تو یہ کُلٌ بن گیا۔ اب اُلٹی سمت سے اگلا حرف "ف" ہے اور پھر "ی"۔ اس طرح یہ فی بن گیا۔ اس کے بعد "ف" آتا ہے۔ پھر "ل" اور آخری حرف "ک" ہے تو یہ فلك ہوگیا۔ چنانچہ الٹی ترتیب سے بھی كُلٌّ فِي فَلَكٍ ہی بنتا ہے۔ یہی سیارگان کی سیدھی حرکت ہے اور انہی لفظوں میں ان کی اُلٹی حرکت بھی مذکور ہے)[1]

تیسری شہادت ــــ "واقعہ تسخیرِ ماہتاب اور قرآن" اس ضمن میں ایک اور شہادت تسخیرِ ماہتاب کے واقعہ سے متعلق ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل امریکہ کے تین سائنس دانوں کے ہاتھوں تسخیرِ ماہتاب کا عظیم تاریخی کارنامہ انجام پذیر ہوا تھا۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے چودہ سو سال پہلے اعلان کر دیا تھا:۔

وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۝ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (الانشقاق: ۱۸، ۱۹، ۲۰)	قسم ہے چاند کی جب وہ پورا ہو جائے، یقیناً تم طبق در طبق اُوپر جاؤ گے۔ پس انہیں کیا ہے پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔

ان تینوں آیات کا باہمی ربط اور سیاق و سباق یہ ہے کہ اس سورت میں قیامت سے پہلے رُونما ہونے والے حادثات اور واقعات کا ذکر ہے۔ مذکورہ بالا آیات سے پہلے اجرامِ فلکی، کائناتی نظام اور بالخصوص نظامِ شمسی کے اہم پہلوؤں کا بیان ہے۔ اسی طرح اس میں کائنات کے اہم تغیرات کا بھی ذکر ہے۔ پھر مختلف قسمیں کھائی گئی ہیں۔ کبھی شفق کی اور کبھی رات کی۔ تیسری قسم چاند کی ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا گیا۔ کہ "تم یقیناً ایک طبق سے دوسرے طبق تک پہنچو گے"۔ یعنی تم طبق در طبق پرواز کرو گے۔

اس آیت کی علماء نے متعدد تفسیرات بیان کی ہیں۔ اس کا معنوی اطلاق "واقعۂ معراج" پر بھی کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے طبق در طبق سے انسانی اعمال و درجات کا بلند ہونا مراد لیا ہے۔ بعض نے حیاتِ انسانی کے مختلف مراحلِ ارتقاء اور احوال مراد لیے ہیں۔ احادیثِ نبوی سے بھی "حال در حال" کے معنی کا استشہاد لیا گیا ہے۔ الغرض اس قسم کی متعدد تعبیرات بیان ہوئی ہیں۔ وہ سب اپنی اپنی

---

[1] امام غزالیؒ سے متعلق اصل حوالہ راقم الحروف کی نظروں سے نہیں گزرا۔ مجھ سے قبلہ والدِ محترم حضرت علامہ فریدالدین قادریؒ نے بیان فرمایا تھا۔

Marfat.com

جگہ درست اور ناقابلِ تردید ہیں لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اگر پہلے کسی آیت کی ایک تفسیر بیان ہو چکی ہو تو اس کا صرف وہی ایک ہی مفہوم ہوگا۔ باقی مفاہیم، مطالب اور تعبیرات غلط ہوں گی۔ تفسیرِ قرآن کے ضمن میں ایسی بات درست نہیں۔ قرآنِ حکیم کی ایک آیت سے اہلِ علم متعدد تعبیرات اخذ کرتے چلے آئے ہیں اور متقدمین و متاخرین کی کتبِ تفسیر اس پر شاہد عادل ہیں۔ مختلف احوال پر انطباق کے اعتبار سے ہر تعبیر اپنی اپنی جگہ درست ہوتی ہے۔ لیکن اس مقام پر ہم اس مخصوص تاریخی واقعہ کے حوالے سے تفسیرِ آیت عرض کرنا چاہتے ہیں۔ اب آیات پر دوبارہ غور فرمائیے:۔

وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ (الانشقاق، ۱۸) قسم ہے چاند کی جب وہ پُورا ہو جائے۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (الانشقاق، ۱۹) یقیناً تم ایک سے دوسرے طبق تک اُوپر جاؤ گے۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (الانشقاق، ۲۰) پس انہیں کیا ہے پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔

قرآنِ حکیم کا اندازِ بیان، ربط بین الآیات اور نظمِ عبارت کا ایک ایک پہلو بلکہ ایک ایک حرف مستقل مفہوم، نمایاں افادیت اور خاص حکمت و مصلحت کا حامل ہوتا ہے۔ "لترکبن طبقاً عن طبق" سے پہلے متصلاً قرآنِ حکیم کا چاند کی قسم کھانا اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ آگے بیان ہونے والی حقیقت چاند سے ہی متعلق ہوگی۔

لَتَرْكَبُنَّ، رکب یرکب سے مشتق ہے۔ اس کا معنیٰ ہے کسی پر سوار ہونا، اسی سے اسم ظرف مَرْکَبٌ نکلا ہے یعنی سوار ہونے یا بیٹھنے کی جگہ، گھوڑے پر سوار ہوتے وقت جس پر پاؤں رکھا جاتا ہے۔ اسے بھی اسی وجہ سے رکاب کہتے ہیں۔

گویا لترکبن کا لفظ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ اُوپر جانا کسی سواری کے ذریعے ہوگا۔

امام راغب اصفہانی رح فرماتے ہیں۔

الرکوب فی الاصل کون الانسان علی ظهر حیوان وقد یستعمل فی السفینة (المفردات)

رکوب اصل میں انسان کے کسی حیوان پر سوار ہونے کو کہتے ہیں۔ لیکن اس کا استعمال جہاز پر بھی ہوتا ہے۔

لہٰذا اوّلیں ترجیح کے طور پر ہم "لَتَرْكَبُنَّ" کے اصلی اور حقیقی معنیٰ کا استعمال مراد لیں گے۔ مجازاً بلند ہونا مراد نہیں لیں گے۔ کیونکہ بعض اوقات کوئی لفظ حقیقی اور مجازی دونوں معنوں پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن عام حالات میں جب کہ حقیقت مستعمل ہو، متعذرہ یا مہجورہ نہ ہو تو مجازی معنوں کی طرف التفات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب تک سائنس اور ٹیکنالوجی اس قدر

Marfat.com

فروغ پذیر نہ ہوئی تھیں کہ انسان زمین سے پرواز کر کے اُوپر کسی دوسرے طبق تک پہنچ سکے اس وقت تک مجازی معنوں کی بنیاد پر ہی آیت کا مفہوم بیان کیا جاتا رہا ہے۔ کیونکہ حقیقی معنیٰ کا اطلاق ممکن نہ تھا۔ لیکن آج جب کہ سائنسی ترقی کے دَور میں فضائی حدود میں انسانی پرواز نہ صرف ممکن بلکہ واقع ہوگئی ہے تو لَتَرْكَبُنَّ کا اپنے حقیقی معنیٰ پر اطلاق بلاشک وشبہ جائز ہوگا۔

مزید برآں لَتَرْكَبُنَّ میں لامِ تاکید اور نونِ ثقیلہ دونوں اظہارِ مقصود میں خصوصی تاکید پیدا کر رہی ہیں۔ جس سے مراد یہ ہے کہ آیتِ متذکرہ میں بیان ہونے والا واقعہ بہرصورت رُونما ہو کر رہے گا۔ کیونکہ یہ ترکیب مستقبل میں صدورِ فعل پر دلالت کیا کرتی ہے۔ لہٰذا یہ آیت پیشینگوئی کے اعتبار سے ایک چیلنج کے طور پر نازل کی گئی اور لَتَرْكَبُنَّ کے اعلان سے قبل پے در پے قسموں کا ذکر منکرینِ قرآن کے لیے اس چیلنج میں مزید شدت اور سنجیدگی پیدا کرنے کے لیے تھا۔ مستزاد یہ کہ لَتَرْكَبُنَّ جمع کا صیغہ ہے اور صیغۂ جمع عام طور پر عربی زبان میں کم از کم تین کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جس سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوگئی کہ لَتَرْكَبُنَّ کے فاعل کم از کم تین افراد ہوں گے۔ جو ایک طبق سے دوسرے تک پرواز کر کے جائیں گے۔ اب پھر آیات اور ان کی ترکیب ملاحظہ کیجئے۔

قرآن قسم کھا کر کہہ رہا ہے کہ "قسم ہے چاند کی جب وہ پورا ہو جائے۔ اے بنی آدم تم میں سے کم از کم تین افراد پرواز کریں گے۔ کہاں سے کہاں تک؟ "طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" ایک طبق سے دوسرے طبق تک۔ پہلا طبق تو یقیناً زمین ہے کیونکہ مخاطب اہلِ زمین تھے اور کسی دوسرے طبق تک جائیں گے۔ دوسرے طبق کا تعین بھی حکیمانہ انداز میں کیا گیا۔ اگر یہاں دوسرے طبق کے لفظ کی بجائے سیدھا چاند ہی کہہ دیا جاتا تو پھر تسخیرِ کائنات کی مہم صرف طبقِ مہتاب تک محصور و محدود ہو کر رہ جاتی اور ربِ ذوالجلال کو یہ منظور نہ تھا کہ انسان کی پرواز زمین کے بعد چاند پر جا کر رُک جائے بلکہ وہ چاند کے بعد دیگر اجرامِ فلکی کی تسخیر بھی چاہتا تھا۔ اس لیے لفظ طبقٍ کو تنوین کے ساتھ عام کر دیا تاکہ یکے بعد دیگرے انسان اجرام و طبقاتِ کائنات کو تسخیر کرتا چلا جائے اور رازِ کائنات فاش کرنے کی مہم جاری رہ سکے۔ لیکن پہلا طبق جس پر اوّلاً انسان پہنچے گا وہ چاند ہوگا۔ اس لیے اس کی قسم پہلے کھائی گئی۔ کیونکہ زمین کے سب سے زیادہ قریب چاند ہی کا طبق تھا۔ باقی سب اس کے مقابلے میں دُور تھے۔ آج سے چودہ سو سال قبل اہلِ زمین کو یہ پیشینگوئی سنائی گئی کہ تم میں سے کم از کم تین شخص کسی چیز پر سوار ہو کر پرواز کریں گے اور زمین کے طبق سے چاند تک پہنچیں گے۔ لیکن تسخیرِ مہتاب کے بعد انسان کی تگ و دو ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ جاری رہے گی۔ اب اسی طرح مریخ کے طبق تک بھی انسان رسائی حاصل کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ انسانی پرواز کی یہ کامیاب کاوشیں دراصل واقعۂ معراج کی صحت و حقانیت پر

Marfat.com

روشن مادی دلیلیں بنتی جارہی ہیں - بقول اقبالؒ ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اور یہ حقیقت بھی ہے کہ معجزات وکرامات جن کے امکان ووقوع کو انسانی عقل منطقی پیمانوں پر سمجھنے سے قاصر تھی - سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ نے کسی حد تک ان کے سمجھنے کی مادی اور عقلی بنیادیں فراہم کردی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ امر منکشف ہوتا جارہا ہے کہ انسان جسے ایک دور میں ناممکن سمجھتا ہے وہ مستقبل میں نہ صرف ممکن بلکہ واقع ہوجاتا ہے - اس لئے نام نہاد تعقل پسند طبقے کے انکارِ خوارق کی یہ دلیل کہ یہ بات عقل کے خلاف ہے اور سمجھ میں نہیں آتی قابلِ التفات نہیں رہتی - کیونکہ عقل کا انحصار صرف محسوسات ومشاہدات پر ہوتا ہے اور جب تک کوئی حقیقت محسوس نہ ہو یا اس کی کوئی مثل مشاہدے میں نہ آئی ہو - عقل اس کے امکان کو کیونکر سمجھ سکتی ہے - اس لیے عقل کا فیصلہ جزئی واضافی ہوتا ہے - وہ کُلّی ومطلق نہیں ہوسکتا - جب کہ قرآن کا ہر دعویٰ ابدی ہے - اس لیے عین ممکن ہے کہ انسانی عقل قرآن کے بعض دیگر دعاوی واعلانات کو آج ممکن نہ سمجھے لیکن مستقبل کے کسی دَور میں وہ سب کچھ ممکن اور واقع نظر آنے لگے - لہٰذا محض عقل کے قصورِ فہم کی بنا پر کسی حقیقت کا انکار کردینا نادانی ہے - عافیت ایمان بالغیب میں ہی ہے -

مزید برآں تسخیرِ ماہتاب کی متذکرہ بالا قرآنی تعبیر کی نسبت اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اس موقع پر تین امریکی سائنسدانوں میں سے صرف دو چاند کی سطح پر اُترے تھے اور تیسرا شخص چاند گاڑی کے اس حصے پر رہا تھا - جو چاند کے گرد گھومتا رہا تاکہ بعدازاں گاڑی کے چاند پر اُترنے والے حصے کو ساتھ ملاکر واپس لاسکے - لہٰذا لتركبن کا اطلاق تین افراد پر کیسے ہوگیا - یہ اعتراض دراصل غور وفکر نہ کرنے کے باعث پیدا ہوگا - بات چاند کی سطح پر اُترنے کی نہیں بلکہ چاند کے طبق تک پہنچنے کی ہورہی ہے اور یہی "لتركبن طبقاً عن طبقٍ" کے الفاظ سے مستفاد ہے - اس امر کا اعتراف تو صاحبِ اعتراض کو بھی ہوگا کہ اس طبق تک تو تینوں ہی افراد پہنچے - ایک گاڑی پر چاند کے گرد گھومتا رہا اور دو اس کی سطح پر اُتر گئے - طبق محض کسی سیارے کی سطح (SOIL SURFACE) کو نہیں کہتے بلکہ کسی سیارے اور اس کے گرد فضائی حدود پر مشتمل اس وسیع وعریض حلقے کو کہتے ہیں جہاں تک اس سیارے کی کششِ ثقل (FORCE OF GRAVITATION) اثر انداز ہوتی ہے اور یہ علاقہ یا طبق سیارے کی سطح کے گرد فضا میں ہزاروں میل تک محیط ہوتا ہے - جس طرح ہوائی جہاز کی پرواز زمین کی سطح پر نہیں بلکہ اس سے اوپر فضا میں ہزاروں فٹ کی بلندی پر ہوتی ہے - لیکن طبقِ ارضی میں ہی تصور کی جاتی ہے -

Marfat.com

چنانچہ قرآن بھی طبقِ ارضی سے پرواز کر کے انسان کے دیگر طبقاتِ فلکی تک پہنچنے کی پیشگوئی کر رہا ہے۔ انسان کی ایسی کامیابیوں کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کائنات کے اندر یعنی آسمانوں اور زمین کی وسعتوں میں جو کچھ موجود ہے وہ انسان کے لیے تخلیق کیا گیا اور انسان ہی کے لیے مسخر کیا گیا ہے۔ جیساکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ، ۱۳) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ تمہارے لیے مسخر کیا گیا ہے۔

اس کے بعد سورۃ انشقاق کی زیرِ مطالعہ آیت سے آگے فرمایا گیا:۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (الانشقاق، ۲۰) پس انہیں کیا ہے پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔

اے فرزندانِ آدم! تم میں سے کچھ افراد زمین سے اُٹھ کر چاند کے طبق تک پہنچیں گے۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ ہمارے اس دعوے کے پورا ہو جانے اور اس طبق پر بھی ہماری قدرت کا نظام دیکھ لینے کے باوجود ایمان نہیں لائیں گے۔ ایمان نہ لانے کا ذکر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تسخیرِ ماہتاب کی مہم غیر مسلموں کے ہاتھ سے سَر ہوگی۔ آپ نے دیکھ لیا کہ تین غیر مسلم سائنسدان چاند تک پہنچے، وہاں بھی تخلیقِ خداوندی کے مناظر دیکھے۔ اس کے نظامِ قدرت کا مشاہدہ کیا۔ لیکن قرآنی دعوے کے مطابق ان کی قوم قرآن کی حقانیت پر ایمان نہ لائی۔

تسخیرِ کائنات کے مذکورہ بالا قرآنی بیان کی تصدیق ایک غیر مسلم فرانسیسی سکالر MAURICE BUCAILLE نے اپنی کتاب "THE BIBLE THE QURAN AND SCIENCE" کے صفحات نمبر ۱۶۷ تا ۱۶۹ پر "THE QURAN AND MODERN SCIENCE" کے باب میں "THE CONQUEST OF SPACE" کے زیرِ عنوان ان الفاظ سے فراہم کی ہے۔

"THE CONQUEST OF SPACE"

From this point of view, three verses of the Qur'an should command our full attention. One expresses, without any trace of ambiguity, what man should and will achieve in this field. In the other two, God refers for the sake of the unbelievers in Makka to the surprise they would have if they were able to raise themselves up to the Heavens; He alludes to a hypothesis which will not be realized for the latter.

There can be no doubt that this verse indicates the possibility men will one day achieve what we today call (perhaps rather improperly) 'the conquest of space'. One must note that the text of the Qur'an predicts not only penetration through the regions of the Heavens, but also the Earth, i.e. the exploration of its depths.

1) The first of these verses is sura 55, verse 33: "O assembly of Jinns and Men, if you can penetrate regions of the heavens and the earth, then penetrate them! You will not penetrate them save with a Power."

Marfat.com

2) The other two verses are taken from sura 15, (verses 14 and 15). God is speaking of the unbelievers in Makka, as the context of this passage in the sura shows:

"Even if We opened unto them a gate to Heaven and they were to continue ascending therein, they would say: our sight is confused as in drunkenness. Nay, we are people bewitched."

The above expresses astonishment at a remarkable spectacle, different from anything man could imagine.

When talking of the conquest of space therefore, we have two passages in the text of the Qur'an: one of them refers to what will one day become a reality thanks to the powers of intelligence and ingenuity God will give to man, and the other describes an event that the unbelievers in Makka will never witness, hence its character of a condition never to be realized. The event will however be seen by others, as intimated in the first verse quoted above. It describes the human reactions to the unexpected spectacle that travellers in space will see: their confused sight, as in drunkenness, the feeling of being bewitched . . .

This is exactly how astronauts have experienced this remarkable adventure since the first human spaceflight around the world in 1961. It is a completely new spectacle therefore that presents itself to men in space, and the photographs of this spectacle are well known to present-day man.

چنانچہ یہ دعوٰے بجا طور پر حق ہے کہ کائنات کے اندر جو کچھ ہو چکا یا ہونے والا ہے۔ اس کا ذکر قرآن کے اندر موجود ہے۔

چوتھی شہادت | جامعیتِ قرآن کی نہایت وقیع اور عملی شہادت یہ بھی ہے کہ قرآن اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کی نجی زندگی کی فکری و عملی ضروریات سے لے کر عالمی زندگی کے جملہ معاملات پر حاوی ہے۔ حیاتِ انسانی کا مذہبی و روحانی پہلو ہو یا مادی و جسمانی، عائلی و خاندانی پہلو ہو یا سماجی و معاشرتی، سیاسی و معاشی پہلو ہو یا تعلیمی و ثقافتی، حکومت و سلطنت کی تاسیس ہو یا ادارت کی تشکیل، مختلف طبقاتِ انسانی کے نزاعات و معاہدات ہوں یا اقوامِ عالم کے باہمی تعلقات، الغرض قرآنی احکام و تعلیمات اس قدر جامع ہیں کہ ہر مسئلے میں اصولی رہنمائی قرآن ہی سے میسر آتی ہے۔ موضوعات کے لحاظ سے علماء نے آیاتِ قرآنی کی تقسیم بھی کی ہے۔ معروف قول کے مطابق قرآنِ حکیم کی کل آیات (۶۶۶۶) کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے۔ آیاتِ امر (۱۰۰۰) آیاتِ نہی (۱۰۰۰) آیاتِ وعدہ (۱۰۰۰) آیاتِ وعید (۱۰۰۰) آیاتِ مثال (۱۰۰۰) آیاتِ قصص (۱۰۰۰) آیاتِ تحلیل (۲۵۰) آیاتِ تحریم (۲۵۰) آیاتِ تسبیح (۱۰۰) آیاتِ متفرقہ (۶۶)

قرآنی احکام کا بیان و استنباط کہیں "عبارۃ النص" سے ہوتا ہے اور کہیں "اشارۃ النص" سے کہیں "دلالۃ النص" سے ہوتا ہے اور کہیں "اقتضاء النص" سے، کہیں اس کا انداز حقیقت ہے کہیں مجاز، کہیں صریح ہے کہیں کنایہ، کہیں ظاہر ہے کہیں خفی، کہیں مجمل ہے کہیں مفسّر، کہیں مطلق ہے کہیں

Marfat.com

مقید، کہیں عام ہے کہیں خاص۔ الغرض قرآنی تعلیمات مختلف صورتوں اور طریقوں میں موجود ہیں۔ ان میں اصل احکام (SUBSTANTIVE LAWS) بھی ہیں اور ضابطہ جاتی (PROCEDURAL LAWS) بھی۔ جیسا کہ اس آیت سے ثابت ہے:۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (المائدہ، ۴۸) ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک اصل قانون بنایا اور ایک اس کا ضابطہ وطریقِ کار

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ فقہاءِ اسلام نے تمام شعبہ ہائے حیات سے متعلق قوانین اور اصول وضوابط کا استخراج اصلاً قرآن ہی سے کیا ہے۔

اسی طرح قرآن علوم کے بیان کے اعتبار سے بھی جامع ومانع ہے۔ دنیا کا کوئی مفید علم ایسا نہیں جس کا سرچشمہ قرآن نہ ہو، قاضی ابوبکر بن عربیؒ اپنی کتاب "قانون التاویل" میں ابتدائی طور پر قرآنی علوم کی تعداد ستتر ہزار چار سو پچاس (۷۷۴۵۰) بیان کرتے ہیں۔ یہی تعداد قرآنِ مجید کے کلمات کی بھی ہے تو اس سے یہ حقیقت مترشح ہوئی کہ قرآنِ حکیم میں الحمد سے والناس تک استعمال ہونے والا ہر کلمہ یقیناً کسی نہ کسی مستقل علم اور فن کی بنیاد ہے۔ گویا ہر قرآنی حرف سے کوئی نہ کوئی علم اور فن جنم لے رہا ہے۔ یہاں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی یہ حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی پیشِ نظر رہے کہ قرآن کے ہر حرف کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور پھر ہر ہر ظاہر و باطن کے لیے ایک حدِ آغاز ہے اور ایک حدِ اختتام۔ اس لحاظ سے ہر قرآنی حرف کے چار پہلو متعین ہوئے۔ چنانچہ قاضی ابوبکر بن عربیؒ متذکرۃ الصدر تعداد کو پھر چار سے ضرب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ درحقیقت قرآنی علوم کی تعداد کم از کم تین لاکھ نو ہزار آٹھ سو (۳۰۹،۸۰۰) ہے۔ یہ تو ایک بزرگ کی وسعتِ نظر ہے۔ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست۔ امام رازیؒ سے پوچھیں تو وہ فرماتے ہیں کہ صرف تعوّذ وتسمیہ (اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) میں لاکھوں مسائل کا بیان ہے اور باقی آیات وکلمات کا تو ذکر ہی کیا۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ علوم کے اعتبار سے بھی قرآن کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ ان کی صحیح تعداد کا نہ شمار ہو سکتا ہے اور نہ اندازہ ــــ ایسے اقوال یا تو ان اکابر کی تحقیقات ہیں یا ان کے ذاتی انکشافات، درحقیقت قرآنی علوم احصار وتحدید سے ماورا ہیں۔ کوئی علم ہو یا فن، کوئی صنعت وحرفت ہو یا پیشۂ تجارت، جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی کوئی دریافت ہو یا علومِ قدیمہ کی، اس کائنات میں کوئی ایسی شے معرضِ وجود میں نہیں آئی اور نہ آسکتی ہے جس کا ذکر خلّاقِ عالم نے کسی نہ کسی انداز سے قرآنِ مجید میں نہ کر دیا ہو۔

فلسفہ (PHILOSOPHY) تمام علوم کا سرچشمہ اور مبدا تصور کیا جاتا ہے۔ علمِ طبیعات (PHYSICS) اور علمِ حیاتیات (BIOLOGY) بھی ابتداءً فلسفے ہی کا حصہ تھے۔ طبیعی کائنات کے حقائق سے بحث کرنے

Marfat.com

والے علوم یہی تین ہیں۔

فلسفہ شروع سے آج تک تین چیزوں سے بحث کرتا چلا آیا ہے کہ حقیقت کیا ہے؟ علم کیا ہے اور کیونکر ممکن ہے؟ اعلیٰ ترین نصب العین کیا ہے؟ گویا فلسفے کی بحث حقیقت، علم اور نصب العین سے ہے۔ اسی طرح طبیعات کا موضوعِ تحقیق یہ ہے کہ موجوداتِ عالم اور مظاہرِ طبیعی کا آغاز کب ہوا؟ کس طرح ہوا؟ اور ان مظاہرِ طبیعی کی حرکت کی علّت کیا ہے؟ حیاتیات کا موضوع یہ ہے کہ انسان اور دیگر مظاہرِ حیات کی اصل کیا ہے؟ اور تمام مظاہرِ حیات کی حرکت اور زندگی کی علّت کیا ہے؟ تینوں علوم کا خلاصۂ مبحث یہ ہوا کہ:۔

فلسفہ کائنات کی حقیقت، اعلیٰ نصب العین اور اس کے علم کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ طبیعات مظاہرِ طبیعی اور ان کی حرکت کو جاننے میں مصروف ہے۔ جب کہ حیاتیات مظاہرِ حیات کے آغاز اور اور ان کے ارتقاء کو سمجھنے میں مشغول ہے۔ آج تک یہ علوم اقدام وخطا TRIAL AND ERROR کے انداز میں اپنی ارتقائی منازل طے کرتے چلے آرہے ہیں اور ان میں سے کسی ایک علم وفن نے بھی یہ حتمی دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے مظاہرِ حیات کے نقطۂ آغاز کو یقینی طور پر جان لیا یا اس نے ان کی حرکت کی علّت کو حتمی طور پر متعین کرلیا ہے۔ اسی طرح فلسفہ آج تک یہ دعوٰے نہیں کرسکا کہ یہ حقیقت، کائنات کی حتمی وابدی حقیقت ہے۔ ہندوستان کے نو کے نو فلسفے نفسِ ناطقہ کو بھی حقیقت مانتے ہیں اور مادہ کو بھی۔

فلسفہ اور قرآن ہزاروں سال کی انسانی جدوجہد کے باوجود آج تک یہ علوم وفنون اپنی صحت اور کمال کی حتمی منزل کو نہیں پہنچ سکے۔ لیکن آخری الہامی کتاب قرآن کا یہ عالم ہے کہ سورۂ علق کی صرف پہلی ہی پانچ آیتوں نے فلسفے کے تمام مسائل کو حل کردیا ہے۔ آیات ملاحظہ ہوں:۔

۱- اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ
۲- خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ
۳- اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ
۴- اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ
۵- عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ
(العلق، ۱-۵)

پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے (سب کچھ) پیدا فرمایا۔ انسان کو خون کے لوتھڑے (یا داعیۂ محبت) سے تخلیق کیا۔ پڑھیے اور آپ کا رب ہی سب سے زیادہ بزرگی والا ہے۔ جس نے قلم سے لکھنا سکھایا (جس نے) انسان کو وہ سکھادیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

اگر غور کریں تو ان آیات میں فلسفہ کے جملہ موضوعات اور ان کے حتمی جوابات بیان کردیئے گئے ہیں۔ فاعتبروا یا اُولی الابصار

ان آیات کی تفسیر اور وضاحت اپنے موقع پر کی جائے گی۔ یہاں صرف اس قدر بیان کرنا مقصود ہے کہ اس کائنات کی حقیقتوں کو جاننے کے لیے آج تک تاریخِ انسانی میں جتنی فلسفیانہ کوششیں

Marfat.com

ہوئی ہیں۔وہ سب قطعیت وحتمیت سے محروم ہیں۔لیکن قرآن کی جامعیت وقطعیت کا یہ عالم ہے کہ صرف پانچ مختصر فقرات میں فلسفے کے تمام موضوعات، مسائلِ تحقیق اور ان کے حتمی جوابات کی نشاندہی کردی گئی ہے۔اب یہ اہلِ تحقیق کا کام ہے کہ وہ اس رُخ پر ریسرچ کریں اور ان حقائقِ کائنات کی کامل معرفت حاصل کریں۔

سائنس اور قرآن اسی طرح طبیعی اور حیاتیاتی سائنس جن مسائل پر تحقیق سے عبارت ہے۔وہ اصطلاحات کی صورت میں درج ذیل ہیں:۔

① تخلیقِ کائنات اور اس کا تشکیلی نظام (CREATION OF UNIVERSE AND ITS STRUCTURAL SYSTEM)

② زمانہ ہائے تخلیق اور ادوارِ ارتقاء (PERIODS OF CREATION AND ERAS OF EUOLUTION)

③ وجودِ کائنات کی طبیعی اور کیمیائی اساس (PHYSICAL AND CHEMICAL BASIS OF THE FORMATION OF UNIVERSE)

④ زمین اور ظہورِ زندگی (EARTH AND APPEARANCE OF LIFE)

⑤ ارتقائے حیات کے طبیعی اور کیمیائی مراحل (PHYSICAL AND CHEMICAL PROCESS OF EVOLUTION OF LIFE

⑥ اجرامِ فلکی کی ماہیت اور نظامِ کار (NATURE AND PHENOMENA OF HEAVENLY BODIES)

⑦ انسانی زندگی کا آغاز اور نظامِ ارتقاء (ORIGIN OF HUMAN LIFE AND ITS DEVELOPMENT)

⑧ نباتات وحیوانات کی زندگی (THE VEGETABLE AND ANIMAL KINGDOMS)

⑨ افزائشِ نسلِ انسانی کا نظام (SYSTEM OF HUMAN PRODUCTION AND SELF PERPETUATION)

ان تمام سائنسی موضوعات پر قرآنِ حکیم نے بہت سا بنیادی مواد فراہم کیا ہے جو اس میں سینکڑوں مختلف مقامات پر مذکور ہے۔ہم استشہاد کے طور یہاں صرف تین مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں:

۱۔ اَوَلَمْ یَرَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا ط کیا ان کافروں نے اس پر غور نہیں کیا کہ کائنات کے بالائی اور زیریں حصے، دونوں باہم پیوست

Marfat.com

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ، اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۪ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚ وَهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَاْئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝

(الانبیاء، ۳۰-۳۴)

تھے یعنی ایک تخلیقی وحدت (UNIT OF CREATION) کی صورت میں موجود تھے۔ ہم نے ان دونوں کو جدا جدا کر کے کھول دیا اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے تخلیق کیا۔ کیا وہ اب بھی ایمان نہیں لائیں گے اور ہم نے زمین کی تیز رفتاری کے باعث اس میں پیدا ہونے والی جنبش کو ختم کرنے کے لیے اس میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیئے تاکہ وہ اپنے اوپر بسنے والی مخلوق کو لے کر کانپے بغیر حرکت پذیر رہے اور ہم نے اس میں (بحری، بری اور فضائی) کشادہ راستے بنائے تاکہ لوگ اپنی اپنی منازلِ سفر تک جا سکیں اور ہم نے آسمانی کائنات کو محفوظ چھت بنایا۔ اور (کیا) وہ اس کی نشانیوں سے اب بھی روگرداں ہیں؟ اور وہی ذات ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند جو اپنے اپنے مدار اور فلک میں گردش پذیر ہیں اور ہم نے آپ سے پہلے کسی بشر (ارضی مخلوق) کو ایسی ہمیشگی اور دوام نہیں بخشا (کہ وہ ہمیشہ اپنے حال پر بدلے یا ختم ہوئے بغیر قائم رہی ہو)۔ اگر آپ انتقال فرما گئے تو کیا یہ طعنہ زنی کرنے والے ہمیشہ رہیں گے؟

۲۔ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۝ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۝ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝

(نوح: ۱۴-۲۰)

حالانکہ اس نے تمہیں نوع بنوع اور درجہ بدرجہ تخلیق کیا۔ یعنی تمہیں تخلیق کے کئی مراحل، ادوار اور احوال سے گزار کر مکمل کیا۔ کیا تم غور نہیں کرتے کہ اللہ نے کس طرح آسمانی کائنات کے سات تدریجی طبقات بنائے اور ان میں چاند کو انعکاسی نور سے روشن کیا اور سورج کو چراغ (کی طرح روشنی کا منبع) بنایا۔ اور اللہ نے تمہیں زمین میں سے سبزے (GENEOLOGICAL TREE) کی طرح اٹھایا۔ پھر وہ تمہیں اسی میں لے جائیگا۔ اور تمہیں دوبارہ نئی زندگی کے ساتھ باہر نکالے گا اور اللہ نے تمہارے

Marfat.com

لیے زمین کو بچھایا ہوا قطعہ بنایا-تاکہ تم اس کے کشادہ راستوں پر چلو-

۳- اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ
ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ؕ مَالَكُمْ مِّنْ
دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا شَفِیْعٍ ؕ اَفَلَا
تَتَذَكَّرُوْنَ ۝ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ
السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ
اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ
سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ ذٰلِكَ عٰلِمُ
الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝
الَّذِیْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ
خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ
نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ۝
ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ
وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ
قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝
(السجدہ : ۴-۹)

اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں یعنی چھ ادوار میں پیدا کیا- پھر وہ عرش یعنی کائنات کے تختِ اقتدار پر جلوہ افروز ہوا- اسے چھوڑ کر نہ تمہارا کوئی کارساز ہے نہ سفارشی- کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ وہ اپنے اوامر اور معاملات کی تدبیر آسمان سے اس لیے کرتا ہے کہ زمین یعنی نچلی کائنات میں ان کا نفاذ اور تعمیل ہو، پھر وہ امُور رفتہ رفتہ اسی کی طرف اُوپر اٹھائے جائیں گے- اس تدریجی مرحلے کی تکمیل ایک دن (ONE ERA OF EVOLUTION) میں ہو گی جس کا عرصہ تمہارے شمار کے مطابق ہزار سال پر محیط ہے- وہی ہر نہاں اور عیاں کا جاننے والا (اور) عزّت و رحمت والا ہے- جس نے ہر اس چیز کو، جسے اس نے پیدا کیا، (اس کے حال کے مطابق) نہایت احسن اور مناسب صورت میں تشکیل دیا- اور اس نے

انسانی تخلیق کی ابتدا زمین کی مٹی یعنی غیر نامی مادے (INORGANIC MATTER) سے کی، پھر اس کی نسل کو کمزور اور بے قدر پانی (DESPISED FLUID) کے نچوڑ سے چلایا- پھر اس وجود کو صحیح شکل و صورت دی اور اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی- یعنی اسے زندگی عطا کی، بعد ازاں تمہیں سماعت اور دل و دماغ (PHYSICAL AND MENTAL FACULTIES) سے نوازا لیکن تھوڑے لوگ ہی ان نعمتوں پر شکر بجالاتے ہیں- یعنی ان کا صحیح استعمال کرتے ہیں-

اگر آپ مذکورہ بالا تین مقامات پر ہی غور و فکر کریں تو یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہو گی کہ طبیعات (PHYSICS) اور حیاتیات (BIOLOGY) کے جملہ مسائل پر اصولی اور بنیادی رہنمائی قرآن میں موجود ہے- قرآن کی اسی وسعتِ علمی کا نام "جامعیت" ہے، جو اس کی وجہ تسمیہ ہے

Marfat.com

علوم و فنون کے اعتبار پانچویں شہادت ——— قرآن تمام نقلی فنون کا ماخذ ہے

سے جامعیتِ قرآن کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ علماءِ اسلام نے جملہ علوم کی انواع و اقسام سب قرآن حکیم سے ہی اخذ کی ہیں۔ قرونِ اولیٰ اور قرونِ وسطیٰ میں جب علوم و فنون کی با قاعدہ تقسیم اور علم و فن کی تفصیلات مرتب کرنے کا کام سرانجام دیا جانے لگا تو علماء کی ایک جماعت نے لغات و کلماتِ قرآن کے ضبط و تحریر کا فریضہ اپنے ذمہ لے لیا۔ اس نے مخارجِ حروف کی معرفت، مدِ کلمات کا شمار سورتوں اور منزلوں کی گنتی، سجدات و علاماتِ آیات کی تعداد و تعیین، حصرِ کلمات، متشابہہ و متماثلہ آیات کا احصار، الغرض تعرضِ معانی و مطالب کے بغیر جملہ مسائلِ قرآت کا کام سرانجام دیا۔ ان کا نام قُراء رکھا گیا اور اس طرح "علم القراۃ و التجوید" منصہ شہود پر آیا۔ بعض نے قرآن کے معرب و مبنی اسماء و افعال اور حروفِ عاملہ و غیر عاملہ وغیرہ کی طرف توجہ کی تو "علم النحو" معرضِ وجود میں آیا۔ بعض نے الفاظِ قرآن، ان کی دلالت و اقتضاء اور ان کے مطابق ہر حکم کی تفصیلات بیان کیں تو "علم التفسیر" وجود میں آیا۔ بعض نے قرآن کے ادلّہ عقلیہ اور شواہد نظریہ کی جانب التفات کیا اور اللہ تعالیٰ کے وجود و بقاء، قدم و وجوب، علم و قدرت، تنزیہہ و تقدیس، وحدانیت و الوہیت، وحی و رسالت، حشر و نشر، حیات بعد الموت اور اس قسم کے دیگر مسائل بیان کیے تو "علم الاصول" اور "علم الکلام" وجود میں آئے۔ پھر انہی اُصولیین میں سے بعض نے قرآن کے معانیِ خطاب میں غور کیا اور قرآنی احکام میں اقتضاء کے لحاظ سے عموم و خصوص، حقیقت و مجاز، صریح و کنایہ، اطلاق و تقیید، نص، ظاہر، مجمل، محکم، خفی، مشکل، متشابہ، امر و نہی اور نسخ وغیرہ میں کلام کیا، انواعِ قیاس اور دیگر ادلّہ کا استخراج کیا تو فنِ "اُصولِ فقہ" تشکیل پذیر ہوا۔ بعض نے قرآنی احکام سے حلال و حرام کی تفصیلات و فروعات طے کیں تو "علم الفقہ" یا "علم الفروع" کو وجود ملا۔

بعض نے قرآن سے گزشتہ زمانوں اور اُمتوں کے واقعات و حالات کو جمع کیا اور آغازِ عالم سے قیامت تک کے آثار و وقائع کو بیان کیا۔ اس طرح "علم التاریخ" اور "علم القصص" وجود میں آئے۔ بعض نے قرآن سے حکمت و موعظت، وعد و وعید، تحذیر و تبشیر، موت و معاد، حشر و نشر، حساب و عقاب اور جنت و نار کے بیانات اخذ کیے۔ جس سے "علم التذکیر" اور "علم الوعظ" کی تشکیل ہوئی۔ بعض نے قرآن سے مختلف خواب اور ان کی تعبیر کے اُصول اخذ کیے تو "علم تعبیر الرؤیا" کی تشکیل ہوئی۔ بعض نے قرآن سے "علم المیراث" اور "علم الفرائض" کی تفصیلات بیان کیں۔ بعض نے رات، دن، چاند سورج اور ان کی منازل وغیرہ کے قرآنی ذکر سے "علم المواقیت" حاصل کیا۔ بعض نے قرآن کے حُسنِ الفاظ، حسنِ سیاق، بدیع نظم اور اطناب و ایجاز وغیرہ سے "علم المعانی"، "علم البیان" اور

Marfat.com

علم البدیع کو مدوّن کیا۔ عرفاءِ کاملین نے قرآن میں نظر و فکر کے بعد اس سے معانی باطنہ اور دقائقِ مخفیہ کا انکشاف کیا۔ انہوں نے اس سے تزکیہ و تصفیہ، فنا و بقا، غیبت و حضور، خوف و ہیبت، انس و وحشت اور قبض و بسط وغیرہ کے حقائق و تصورات بھی اخذ کیے۔ جن سے "علم التصوف" کی تشکیل ہوئی۔

بعض علماء نے قرآن سے طب، ہیئت، ہندسہ، جدل، جبر و مقابلہ، نجوم اور مناظرہ وغیرہ کے علوم و فنون اخذ کیے اور ان کی تفصیلات بھی طے کیں۔ اس طرح یہ مقدس اور جامع الہامی کتاب بالفعل دنیا کے ہر فن اور علم کے لیے منبع و سرچشمہ قرار پا گئی۔

امام موسیٰؒ نے مزید تفصیل کے ساتھ مذکورہ بالا موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ جس کی تلخیص امام جلال الدین سیوطیؒ نے الاتقان میں کی ہے۔ الغرض دنیا میں موجود ہر فن و صنعت جو انفرادی، اجتماعی اور عالمی سطح پر انسانی زندگی کی بقا و دوام اور فروغ و ارتقاء کے لیے ضروری ہے اصلاً قرآن سے ثابت ہے۔ علوم و فنون کے حوالے سے قرآنِ مجید کی جامعیت کے اس بیان سے یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہو گئی کہ قرآن اپنے ماننے والوں کو محض ذکر و عبادت اور اخلاق و روحانیت کا ہی درس نہیں دیتا بلکہ دنیا میں ہر قسم کی علمی، فنی، صنعتی، سائنسی اور فوجی ترقی کی راہیں بھی کشادہ کرتا ہے تاکہ ملتِ اسلامیہ ایک ہمہ گیر ترقی پسند امت کے طور پر ابھرے اور آفاقی سطح پر انقلاب بپا کر کے عظیم مقام حاصل کر لے۔ کیونکہ اس کے بغیر عالمگیر غلبۂ حق کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اسی کی نشاندہی قرآن نے پیغمبرِ اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کے حوالے سے فرمادی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:-

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ

(الصف، ۹)

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسولِ معظم کو ہدایت اور دینِ حق دے کر اس لیے بھیجا کہ اس نظامِ حق کو دنیا کے تمام نظاموں پر غالب کر دے۔ بیشک مشرک یعنی کفر و طاغوت کے علمبردار اس کی مخالفت کرتے رہیں۔

اسی جامعیت کی بناء پر ربِ ذوالجلال نے اس مقدس کتاب کا نام "القرآن" رکھا۔ کیونکہ انبیاء ماسبق کے زمانوں میں وحی کا سلسلہ جاری تھا اور ہر ایک الہامی کتاب کا بدل اگلے زمانے میں بنی نوعِ انسان کو کسی دوسری الہامی کتاب یا صحیفے کی صورت میں میسّر آ رہا تھا۔ اس لئے ان کتابوں کو اس قدر جامع بنانے کی ضرورت نہ تھی اور نہ ہی کسی کتاب کو ہمیشہ کے لیے اس حیثیت میں باقی رہنا تھا۔ لیکن ان کے برعکس خاتم الانبیاء علیہ السلام کے بعد نہ کوئی اور نبی یا رسول آسکتا تھا اور نہ قرآن کے بعد کوئی آسمانی وحی۔ چنانچہ ضروری تھا کہ نبوّتِ محمدی صلے اللہ علیہ وسلم کو آفاقی، کائناتی، ابدی، کُلّی، حتمی، قطعی اور آخری بنانے کے لیے ہر اعتبار سے کامل اور

Marfat.com

جامع بنایا جائے اور اس طرح وہ کتاب جو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اسے بھی عالمگیر اور ابدی بنانے کے لیے اس قدر جامع کیا جائے کہ انسانیت کو سب کچھ اس کتاب کے دامن سے میسّر آسکے اور کسی کو دوسری سمت میں متوجہ ہونے کی کوئی ضرورت ہی نہ رہے۔ لہٰذا قرآن اپنی جامعیت کا ذکر اس انداز میں کرتا ہے :۔

يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ
(البینۃ ، ۲-۳)

وہ اس قرآن کی تلاوت کرتا ہے جو ایسا مقدس صحیفۂ آسمانی ہے کہ اس میں تمام آسمانی کتب کے علوم، ان کے ثمرات و مطالب اور حیاتِ انسانی کے تمام مفید و صحیح ضابطے درج ہیں۔

کوئی ضرورت کی چیز جس پر انسانی زندگی کا انحصار ہو قرآن سے خارج نہیں۔ باوجود قلّتِ حجم کے اس میں وہ تمام علوم و معارف بیان کردیئے گئے ہیں۔ جن کا احصار و استیفار کوئی فرد نہیں کرسکتا تھا۔ خود قرآن اعلان کرتا ہے :۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ
(لقمٰن ، ۲۷)

اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں سب قلم بن جائیں اور سمندر ان کی سیاہی۔ اس کے بعد سات سمندر اور ہوں تو بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے (یعنی کلامِ الٰہی کی وسعت و جامعیت کا احاطہ نہیں ہوسکے گا) بیشک اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔

قرآنِ مجید کے اسی اعجازِ جامعیت اور ابدی فیضان کا ذکر کرتے ہوئے امام جلال الدین سیوطی یہ شعر نقل کرتے ہیں :۔

كالبدر من حيث التفت رايته ۔۔۔ يهدى الى عينيك نوراً ثاقباً
كالشمس فى كبد السماء وضوءها ۔۔۔ يغشى البلاد مشارقاً و مغارباً

(قرآن چودھویں رات کے چاند کی مانند ہے تو اسے جس طرف سے بھی دیکھے وہ تیری آنکھوں کو چمکتا ہوا نور عطا کرے گا۔ یہ قرآن آفتاب کی طرح آسمان کے وسط میں ہے۔ لیکن اس کی روشنی دنیا کے مشارق و مغارب سب کو ڈھانپ رہی ہے)

مذکورہ بالا وضاحت سے یہ امر اچھی طرح آشکار ہوگیا ہے کہ قرآن کی پہلی وجہ تسمیہ اس کی معنوی جامعیت ہے۔ جو آج تک اس شان سے دنیا کی کسی کتاب کو نصیب نہیں ہوسکی۔

~~68443~~ 85943

Marfat.com

لفظِ قرآن کا دوسرا مادۂ اشتقاق۔ قَرَنَ

لفظِ قرآن کا دوسرا مادۂ اشتقاق قَرَنَ ہے جس کے معنی اکٹھا کرنے اور ملانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے :۔

قَرَنَ الشَّیَٔ بالشیٔ — اس شخص نے ایک چیز کو دوسری کے ساتھ ملا دیا

لہٰذا ا۔ القرآن پر قَرَنَ کے لغوی معنیٰ کا اطلاق اس طرح ہوگا کہ یہ وہ کتاب ہے جس کی ہر سورت دوسری سورت کے ساتھ، ہر آیت دوسری آیت کے ساتھ، ہر لفظ دوسرے لفظ کے ساتھ اور ہر حرف دوسرے حرف کے ساتھ اس طرح متصل ہے کہ انہیں الگ نہیں کیا جاسکتا۔

امام ابوالحسن اشعریؒ اور ان کے اتباع اسی نقطۂ نظر کی تائید فرماتے ہیں۔ امام فخر الدین رازی نے امام سفیان ثوریؒ کا ایک قول یوں نقل فرمایا ہے :۔

سمی القرآن قرآنًا لان الحروف جمعت فصارت کلمات، والکلمات جمعت فصارت آیات، والآیات جمعت فصارت سورًا، والسور جمعت فصارت قرآنًا، ثم جمع فیہ علم الاولین والآخرین

قرآن کا نام قرآن اس لیے رکھا گیا کہ حروف آپس میں ملائے گئے تو کلمات بنے، کلمات ملائے گئے تو آیات بنیں، آیات ملائی گئیں تو سورتیں بنیں اور سورتیں باہم ملائی گئیں تو قرآن بنا، پھر اس میں اولین و آخرین کے سب علوم جمع کر دیئے گئے۔

(تفسیر کبیر جلد ۱ صہ ۲۳۸)

ب۔ قَرْنٌ سے ہی "اقتران" ہے جو بابِ افتعال سے مصدر ہے اور "ازدواج" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جوڑے کے مل جانے اور دو کے اکٹھا ہو جانے (UNION AND CONJUNCTION) کو عربی زبان میں ازدواج کہا جاتا ہے۔ جب تک ازدواجیت رہتی ہے۔ خاوند اور بیوی کی علیحدگی متصور نہیں ہوتی اور جونہی یہ الگ ہوتے ہیں رشتۂ ازدواج باقی نہیں رہتا۔ امام راغب اصفہانیؒ المفردات میں فرماتے ہیں کہ ازدواج کی یہی معنویت اقتران میں بھی موجود ہے۔

اس اعتبار سے قرآن کا معنی کسی چیز کے ساتھ اس کتاب کا ایسا اتحاد اور اتصال یعنی اقتران و ازدواج ہے کہ دونوں کا ایک دوسرے سے جُدا ہونا ممکن نہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے :۔

قرنت البعیر بالبعیر ای جمعتُ بینھما — میں نے ایک اونٹ کو دوسرے کے ساتھ ملا کر باندھ دیا

قرآن کا قرن سے مشتق ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اسے کسی وصف کے ساتھ اس طرح ملا دیا گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے۔

Marfat.com

ج۔ اسی طرح قَرَنٌ سے "اِقْرَانٌ" بھی نکلا ہے۔امام راغبؒ فرماتے ہیں۔

القِران الجمع بين الحج والعمرة (المفردات) قِران حج اور عمرہ دونوں کو اکٹھا کرنے کا نام ہے

اس مادّے کے تمام مشتقات میں اتصال اور باہم پیوستگی کا مفہوم موجود ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی خوبی اور وصف ہے جو قرآن کے ساتھ اس حد تک متصل اور پیوست ہے کہ اس میں اور قرآن میں دوئی یا علیحدگی کا کوئی تصوّر باقی نہیں رہا۔صاف ظاہر ہے کہ وہ خوبی "ہدایت اور راستی" ہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن سے اس طرح پیوست کر دیا ہے کہ یہ اس سے جدا نہیں اور وہ اس سے جدا نہیں۔یعنی قرآن اور راہِ ہدایت کے درمیان فرق کرنا ہی ممکن نہیں رہا۔کیونکہ ان کی باہم پیوستگی کا عالم یہ ہے کہ خود قرآن کو عین "حق و ہدایت" سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔جیسا کہ "ھدیً للناس" اور "ھدیً للمتقین" کے الفاظ سے ظاہر ہے۔قرآنِ مجید نے اپنے متعدد اوصاف و خصائص بیان کیے ہیں۔جن کا جائزہ لینے سے ہمیں مذکورہ بالا حقیقت کی مکمّل تصریح میسر آجاتی ہے۔

قرآن اور ہدایت کا باہم متصل ہونا ۱۔قرآنِ حکیم سب سے پہلے جس مقام پر اپنا تعارف کراتا ہے وہ سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات ہیں:۔

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (بقرہ، ۲-۳)

یہ وہ کتاب ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں (اور) جو متقین کے لیے ہدایت ہے

یہاں تعارفِ قرآن کے سلسلہ میں ایک ہی خوبی کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہے اس کا ہدایت ہونا۔

۲۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (آلِ عمران، ۱۳۸)

یہ قرآن بنی نوعِ انسان کے لیے واضح بیان اور ہدایت ہے اور متقین کے لیے سراسر موعظت و نصیحت۔

اس آیت میں قرآن نے خود کو واضح بیان اور ہدایت کے نام سے تعبیر کیا ہے اور خود کو موعظت و نصیحت کے عنوان سے بھی پیش کیا ہے۔

۳۔ تیسرے مقام پر قرآن اپنا تعارف یوں کراتا ہے:۔

فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (اعراف، ۵۲)

ہم نے اس قرآن کو علم (بصیرت اور معرفت) کے ساتھ مفصّل کر دیا اور یہ قرآن ایمان والوں کے لیے سراسر ہدایت و رحمت ہے۔

اس جگہ قرآن نے اپنے آپ کو مفصّل علم کہا ہے اور اہلِ ایمان کے لیے خود کو سراسر ہدایت و رحمت کے نام سے موسوم کیا ہے۔

Marfat.com

۴۔ ایک اور مقام پر قرآن اپنا تعارف یوں کراتا ہے :۔

قَدْ جَاءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَ شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ (یونس ، ۵۷)

اے نسلِ انسانی ! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس موعظت و نصیحت آگئی اور جن لوگوں کے سینوں میں بیماریاں ہیں اُن کے لیے شفا ہے اور یہ قرآن اہلِ ایمان کے لیے ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی۔

یہاں قرآنِ مجید نے خود کو موعظت، شفاء، ہدایت اور رحمت کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

۵۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہے :۔

وَلٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (یوسف : ۱۱۱)

قرآن، جو کچھ انبیاء اپنے ساتھ لے کر آئے تھے اس کی تصدیق کرنے والا ہے اور ہر شے کی تفصیل ہے اور اہلِ ایمان کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔

یہاں تفصیل، تصدیق اور اہلِ ایمان کے لیے ہدایت و رحمت کے اوصاف گنوائے گئے ہیں۔

۶۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے :۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ (النحل، ۸۹)

یہ قرآن جو ہم نے آپ پر نازل کیا ہے کائنات کے ہر ہر ذرّے کا تفصیلی علم مہیّا کرنے والا ہے اور یہ ہدایت و رحمت ہے اور اہلِ ایمان کے لیے بشارت بھی ہے۔

۷۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے :۔

هٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ (الجاثیہ : ۲۰)

یہ نسلِ انسانی کے لیے بصیرت و تنبیہ ہے اور ہدایت و رحمت ہے یقین والوں کے لیے۔

مذکورہ بالا سب آیات کا جائزہ لیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ قرآن ہر جگہ اپنی خصوصیات اور حیثیات کا عنوان بدلتا رہا ہے لیکن ایک حیثیت شروع سے آخر تک بلا استثناء مذکور ہوتی چلی گئی ہے اور وہ "ہدایت" ہے قرآن کی مختلف حیثیتوں کا یہ عالم ہے کہ یہ گمراہوں کے لیے ہدایت ہے، نہ جاننے والوں کے لیے علم ہے۔ غافلوں کے لیے موعظت و نصیحت ہے۔ کم فہموں کے لیے واضح بیان ہے۔ بیماروں کے لیے شفا ہے۔ مایوسوں کے لیے بشارت ہے، پریشان حال لوگوں کے لیے رحمت ہے۔ سابقہ انبیاء کی تعلیمات اور ان کی نبوتوں کے لیے تصدیق ہے۔ ابہام و اجمال کے لیے تفصیل ہے اور مجرموں اور ظالموں کے لیے

Marfat.com

تنبیہہ وبصیرت ۔ الغرض قرآن کی مختلف حیثیتیں نسلِ انسانی کے مختلف طبقات کی ضرورتوں اور تقاضوں کے اعتبار سے ہیں ۔ لیکن قرآن شفا ہو یا نصیحت ، رحمت ہو یا موعظت ، تصدیق ہو یا تفصیل علم ہو یا تنبیہہ ۔ اس کا ہدایت ہونا ہر حیثیت میں یکساں طور پر کارفرما ہے ۔ اسی لیے اس مقدس کتاب کے بارے میں کہا گیا ہے :۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ — یہ متقین کے لیے سراسر ہدایت ہے

یعنی ہم نے اس کتاب کے ساتھ اپنی ہدایت اور رہنمائی کو اس طرح متحد کر دیا ہے ۔ کہ ہدایت سراسر قرآن اور قرآن کا سراسر ہدایت ہو گیا ہے ۔ اور یہی لفظِ قرآن کی وجہ تسمیہ ہے ۔ اس لیے قرآن سب سے پہلا دعویٰ ہی یہی کرتا ہے کہ یہ پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے ۔

قرآنی ہدایت کا دائرہ اثر یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس مقدس کتاب سے ہدایت صرف وہی لوگ حاصل کر سکیں گے جو تقویٰ اور پرہیزگاری کے زیور سے آراستہ ہوں یا عاصی اور خطاکار بھی قرآنی ہدایت سے استفادہ کر سکتے ہیں ؟

اس کا جواب یوں ملتا ہے :۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ

(البقرہ : ۱۸۵)

رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس میں ہم نے قرآن کو نازل فرمایا ۔ یہ بنی نوع انسان کے ایک ایک فرد کے لیے ہدایت ہے یہ خود ہدایت کیلیے روشن دلیل بھی ہے اور حق و باطل میں واضح امتیاز کرنے والا بھی ۔

قرآن اپنے مقصدِ نزول کے تعارف کی نسبت سے تین جملے بیان کر رہا ہے اور تینوں جملے درحقیقت ہدایت ہی کے تین مدارج و مراحل ہیں ۔ پہلے فرمایا " هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ " کہ یہ متقین کے لیے ہدایت ہے ایک عام انسان کے ذہن میں خلش پیدا ہوئی کہ " کیا قرآن سے پرہیزگاروں کے سوا عام انسان کو ہدایت میسر نہیں آسکتی " ؟ تو قرآن نے جواب دیا ۔ هُدًى لِّلنَّاس ۔ یہ نسلِ انسانی کے ہر فرد کے لیے بھی ہدایت ہے یہاں ہدایت سے مراد وہ روشنی ہے جس سے منزلِ مقصود کا تعین ہو سکے ۔ قرآن نے اس کے بعد کہا کہ یہ صرف ہدایت کا دعویٰ ہی نہیں بلکہ " وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى " یہ دعوئے ہدایت کی دلیل بھی ہے ۔ کیونکہ اس میں ہدایت کی روشن دلیلیں اور واضح ثبوت ہیں ۔ گویا دعوے کے ساتھ اپنی صحت اور

Marfat.com

حقانیت کی دلیلیں بھی قرآن میں ہی موجود ہیں۔ اس کے بعد فرمایا " والفرقان " یعنی یہ ایسی ہدایت نہیں جس کے مل جانے کے بعد بھی حق و باطل میں بھوتے کا کوئی تصور باقی رہ سکے۔ یہ ایسی رہنمائی نہیں جس کے میسّر آجانے کے بعد خیر و شر میں امتیاز نہ ہو سکے۔ ہم ایسی رہنمائی کو ہدایت ہی نہیں سمجھتے جو حق و باطل کے درمیان تفریق اور خیر و شر کے درمیان خدِ فاصل قائم نہ کر سکے۔ قرآن کہتا ہے کہ میری ہدایت وہ ہدایت ہے جس کے آجانے کے بعد حق، حق ہو جاتا ہے اور باطل، باطل۔ پھر کسی اعتبار سے بھی خیر و شر اور صدق و کذب میں نہ کوئی امتزاج باقی رہتا ہے اور نہ اتحاد و یگانگت۔ اسی لیے باری تعالیٰ نے اعلان فرمایا:۔

جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (بنی اسرائیل: ۸۱)

حق آیا تو باطل بھاگ گیا۔ بیشک باطل بھاگنے والا ہی تھا۔

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (انفال: ۸)

تاکہ حق کو حق ثابت کر دے اور باطل کو باطل۔ بیشک مجرم اس امتیاز کو ناپسند کرتے رہیں۔

مزید ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

الٓرٰ ۣ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (ابراہیم: ۱)

ہم نے یہ کتاب آپ کی طرف اس لیے نازل فرمائی ہے کہ آپ انسانیت کو اس ظلمت کدۂ عالم کی گمراہیوں سے نکال کر ہدایت کے اُجالے تک پہنچا دیں۔

ایک اور مقام پر کہا گیا ہے:۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (اسراء: ۹)

بیشک یہی قرآن ہے جو صحیح اور پختہ راستے کی ہدایت دیتا ہے۔

ایک اور مقام پر قرآن نے اپنے ہدایت ہونے کے ضمن میں فرمایا ہے:۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ (الزمر: ۴۱)

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ پر یہ کتاب نازل کی ہے۔ پس جو کوئی اس قرآن سے ہدایت پائے گا۔ اس کا فائدہ اس کی اپنی ذات کو پہنچے گا۔

قرآنی ہدایت ہر سطح پر خوف و غم سے نجات کی ضامن بھی ہے۔ اس وصفِ ہدایت کا بیان یوں کیا گیا ہے:۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرہ: ۳۸)

اے نوعِ انسانی! جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آجائے تو جو کوئی میری نازل کردہ ہدایت کی پیروی کرے گا۔ اس پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم۔

Marfat.com

ایک اہم نکتہ یہاں ایک اہم حقیقت کا بیان ضروری ہے کہ قرآنی فکر کے بعض علم برداروں نے قرآنی ہدایت کو اس طرح محصور و محدود کر دیا ہے کہ قرآن کی ہدایت انسان کو آخرت کے خوف و غم سے تو محفوظ کر سکتی ہے مگر اس دنیا کے خوف و غم سے محفوظ رکھنے کی ضمانت اپنے دامن میں نہیں رکھتی حالانکہ اس آیت کا سیاق و سباق یہ کہہ رہا ہے کہ انسانیت کو اس دنیوی زندگی میں کچھ خطرات درپیش ہوں گے۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (بقرہ: ۳۶) اس دنیا میں تمہاری آپس کی عداوتیں ہونگی، باہمی بغض و عناد ہوگا لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں گے، لیکن یہ دشمنی اور عداوت کس بنیاد پر ہوگی؟

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (البقرۃ: ۳۶) تمہیں ایک خاص مدت تک اس زمین پر رہنے اور اپنی ضروریات پوری کرنے کا حق دے دیا گیا ہے۔

تم میں سے کچھ لوگ چاہیں گے کہ دوسروں سے جینے کا حق چھین لیا جائے۔ مستحکم ہونے کا حق بھی سلب کر لیا جائے۔ جب کہ کچھ لوگ چاہیں گے کہ انسانیت کے یہ حقوق بتمام و کمال محفوظ رہیں۔ گویا حق و باطل کے درمیان یہ ٹکراؤ اور محاذ آرائی جاری رہے گی حق و باطل کا یہ معرکہ نسلِ انسانی کو خوف و غم کی اذیت ناک کیفیت میں مبتلا کر دے گا۔ لیکن بنی آدم کو خوف و غم کی اس محیط کیفیت سے دنیا کا کوئی نظام نجات نہیں دے سکے گا۔ سوائے ہدایتِ ربانی کے۔ تعجب ہے کہ انسانی زندگی کو خطرات و خدشات تو اس دنیا میں درپیش ہوں جبکہ قرآن کی ہدایت صرف آخرت میں ہی خوف و غم سے نجات دینے کا وعدہ کرے۔ یوں تو دشمنِ اسلام یقیناً یہی کہیں گے کہ اس دنیا میں (معاذ اللہ) شیطان نے خدا کو شکست دے دی۔ رہا آخرت کا حال تو وہ آخرت میں دیکھا جائے گا (معاذ اللہ، استغفر اللہ) حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی وہ ہدایت جو آخرت کے خوف و غم سے نجات دے سکتی ہے اس سے پہلے اس دنیا کے ہر خوف و غم سے نجات دینے کی بھی ضامن ہے۔ لہٰذا یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ قرآن خود ایسی ہدایت ہے جو دُنیوی اور اُخروی ہر قسم کے خوف و غم سے نجات دلانے کی ضامن ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ شاید قرآن صرف انفرادی سطح کی ہدایت مہیّا کرتا ہے۔ اجتماعی اور بین الاقوامی سطح کی نہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ ایک فرد کی نجی زندگی سے لے کر قوم کی اجتماعی اور انسانیت کی عالمی زندگی تک کی ہدایت کا ضامن ہے۔

انفرادی زندگی اور قرآنی ہدایت

إِنَّ هَٰذِهِ تَذْكِرَةٌ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا (المزمل: ۱۹) یہ قرآن ایسا ضابطۂ نصیحت اور ہدایت کا چارٹر ہے کہ جس شخص کا جی چاہے اس کا دامن تھام کر خدا کی راہ کو پالے۔

Marfat.com

قومی زندگی اور قرآنی ہدایت

اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ

(زخرف : ۴۴)

یارسول اللہ! یہ قرآن آپ کے لئے اور آپ کی پوری قوم وملت کے لیے ہدایت ونصیحت ہے۔

عالمی زندگی اور قرآنی ہدایت

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ

(انعام: ۹۱)

یہ قرآن تمام عالم کے لئے ہدایت ونصیحت ہے۔

مذکورہ بالا شواہد سے یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ قرآن سے جو ہدایت حاصل ہوتی ہے وہ صرف نجی زندگی کے لیے نہیں بلکہ اجتماعی زندگی کے تمام احوال پر بھی محیط ہے۔ گویا قرآن اور ہدایت کا یہ اتحاد انسانیت کو اس طرف متوجہ کر رہا ہے کہ اے راہِ حق کے متلاشیو! اگر حق کی تلاش ہے تو قرآن کا دامن تھام لو۔ اس لیے کہ حق وہدایت صرف قرآن کے ساتھ پیوست اور مختص ہے۔ یہی اعلان درحقیقت لفظِ قرآن کا دوسرا معنیٰ ہے۔

ہدایت کے مدارج ومراتب قرآن جس ہدایت کا تصور دیتا ہے۔ اس کے تین درجے ہیں ۱۔ عرفان الغایۃ ۲۔ ارائۃ الطریق ۳۔ ایصال الی المطلوب۔ راستہ دیکھنے کی طلب اور دکھانے کی ضرورت اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک منزل کا شعور اور تعین نہ ہو۔ اس لیے ہدایت کا پہلا درجہ عرفان الغایۃ (منزل کی معرفت) ہے۔ غرض وغایت اور منزلِ مقصود کا تعین ہوجائے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس منزل تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟ یہاں ہدایت کے دوسرے درجے ارائۃ الطریق (راستہ دکھانا) کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے ذریعے راستے کی راہنمائی ملتی ہے۔ اب قابلِ غور امر یہ ہے کہ اگر ایک شخص آپ کو منزل کا راستہ بتا دے اور منزل بہت دُور ہو تو صرف راستہ بتا دینے میں کیا ضمانت ہے کہ آپ یقیناً منزل کو پالیں گے۔ ممکن ہے آپ آگے جا کر بھٹک جائیں۔ گویا راستہ بتا دینا ہدایت تو ہے لیکن ہدایتِ ناقصہ ہے کاملہ نہیں۔ اس لیے قرآن تیسرے درجے کی ہدایت بھی مہیا کرتا ہے جسے ایصال الی المطلوب (منزل تک پہنچا دینا) کہتے ہیں۔ گویا قرآن اور ہدایت کا باہمی تعلق یہ ہے کہ منزل کا تعین کر دینے اور راستہ دکھا دینے کے بعد قرآن آپ سے لاتعلق نہیں ہوجاتا بلکہ ایسی ہدایت بھی مہیا کرتا ہے جو آپ کا بازو پکڑ کر منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ قرآنی ہدایت کا عالم یہ ہے کہ اگر کسی کو اپنی زندگی کے مقصد کا تعین درکار ہو تو یہ اس کی نشاندہی کرتی ہے۔ اگر کسی کو راستے کی تلاش ہو تو یہ اس کی راہنمائی کرتی ہے۔ اور اگر مقصد تک پہنچنا درکار ہو تو قرآنی ہدایت مقصد تک پہنچانے کی ضمانت بھی مہیا کرتی ہے۔

ہدایت کے ان تینوں مدارج کا ذکر بھی قرآن میں موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

Marfat.com

وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ (التغابن : ۱۱) جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے۔ اس کے دل کو ہدایت نصیب ہو جاتی ہے۔

یہ ہدایت کا پہلا درجہ ہے جسے عرفان الغایۃ یعنی شعورِ مقصد اور منزل کی معرفت کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک اور مقام پر ہدایت کے دوسرے درجے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:۔

وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (البقرہ : ۱۴۲) اللہ جسے چاہتا ہے۔ سیدھے راستے کی طرف ہدایت دے دیتا ہے۔

یہ دوسرے درجے کی ہدایت تھی۔ جو صرف راستہ دکھانے سے متعلق ہے۔ تیسرے درجے کی ہدایت کی نسبت قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰنَا لِهٰذَا (اعراف : ۴۳) تمام تعریف اس رب کی ہے جس نے ہمیں اس منزل تک پہنچا دیا۔

گویا قرآن ہر درجۂ ہدایت کے اعتبار سے انسانیت کی رہنمائی کرتا ہے۔ قرآن نسلِ انسانی کے ہر طبقے کو دعوت دے رہا ہے کہ جس کو جس طرح کی رہنمائی کی ضرورت ہو مجھ سے حاصل کرلے۔ کیونکہ شعورِ نصب العین کی بیداری بھی تمسک بالقرآن سے ممکن ہے اور حصولِ منزل بھی اسی سے۔ آج مشرق و مغرب کی جملہ اقوام بالعموم جس تشتت و افتراق، اضطراب و التہاب اور اخلاقی بے راہروی کا شکار ہیں قرآنی ہدایت سے فیضیاب ہوئے بغیر اس سے نجات نہیں پا سکتیں۔ ملتِ اسلامیہ، جس کا اعتماد اس دورِ زوال میں قرآنی ہدایت کی اثر انگیزی اور نتیجہ خیزی پر بحال نہیں رہا۔ افکارِ اغیار کی دریوزہ گری کرنے لگی ہے قرآن کا نام لینے والے اس دنیا کے لیے قرآن کو عملاً صحیفۂ ہدایت نہیں سمجھ رہے۔ ہماری فکری قیادتیں بالعموم ذہنی مرعوبیت کا شکار ہو چکی ہیں اور نتیجۃً قرآنی فکر کو احقاقِ حق کے بجائے باطل سے سمجھوتے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اگر حق اور باطل کا صحیح امتیاز پیشِ نظر رکھ کر ہر قسم کی ہدایت فی الواقع قرآن ہی سے طلب کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ملتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا کھویا ہوا وقار بحال نہ کرا سکے۔

قرآن پڑھنے کے باوجود گمراہی کا امکان قرآن صحیفۂ ہدایت ہے لیکن ملتِ اسلامیہ میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو قرآنی فکر کا نام لے کر بھی اس سے دُور جا رہے ہیں اور قرآن پڑھ کر بھی گمراہی کے راستوں پر چل رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں قرآن ہی سے اس مسئلے کا حل تلاش کرنا ہوگا۔ کیونکہ قرونِ اُولیٰ اور قرونِ وُسطےٰ میں بیشمار طبقے ایسے ہو گزرے ہیں۔ جو بکثرت قرآن پڑھتے تھے لیکن علی التحقیق گمراہ قرار دیئے گئے۔ مثلاً خوارج، معتزلہ، مرجیہ، باطنیہ وغیرہم۔ یہ سب قرآن سے استدلال کرتے تھے۔ مگر ظاہراً تمسک بالقرآن کے باوجود گمراہ ہو گئے۔ آج بھی مسلمانوں میں فکری سطح پر اُٹھنے والی کسی الحادی اور انحرافی تحریکات

Marfat.com

اپنے اپنے نقطۂ نظر کو قرآن ہی سے ماخوذ قرار دیتی ہیں لہٰذا قرآن پڑھنے اور سمجھنے کا محض دعویٰ کسی کے لیے سندِ صحت وصداقت نہیں ہوسکتا۔ پیغمبرِ اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری زمانے میں کئی ایسے فتنوں کا ذکر فرمایا ہے جن میں بعض لوگوں کو قرآن اور عبادات سے ظاہری تمسک کے باوجود لادین اور گمراہ قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا جو لوگ اپنی فکر ودانش کو حرفِ آخر اور عقلِ کل سمجھتے ہیں اور ہر بات کی صحت وعدمِ صحت یا حق وبطلان کا فیصلہ صرف اپنی رائے سے کرتے ہیں۔ وہ بدنصیب قرآن پڑھ سُن کر بھی قرآنی ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کی قرآن فہمی اور قرآن دانی صرف اپنے افکارِ ذہنی کی تائید اور اپنی خواہشاتِ نفسانی کی تسکین سے عبارت ہوتی ہے۔ اس لیے ان کا ظاہراً کثرت سے قرآن پڑھنا، ہدایت یافتہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ اپنے باطنی فسق اور ذہنی آمریت کے باعث قرآن کے اسی حکم سے جس سے اہلِ طاعت ہدایت پاتے ہیں، گمراہی حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔ انہی کی نسبت ارشاد فرمایا گیا ہے "وَ یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَیَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا وَمَا یُضِلُّ بِہٖ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ" (اور وہ اسی سے بہتیروں کو گمراہ کرتا ہے۔ اور بہتیروں کو ہدایت دیتا ہے۔ اس سے انہی لوگوں کو گمراہ کرتا ہے جو پہلے ہی فاسق ہیں) یہ امر ذہن نشین رہے کہ فسق بعض اوقات نماز روزہ اور تلاوتِ قرآن کے باوجود بھی ہوسکتا ہے۔ ایک متفق علیہ حدیث میں مذکور ہے کہ حضور علیہ السلام نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

فانّ لہٗ اصحابًا یحقر احدکم صلٰوتہٗ مع صلٰوتھم وصیامہٗ مع صیامھم یقرؤن القرآن لا یجاوز تراقیھم یمرقون من الدین کما یمرق السھم من الرمیۃ

(البخاری ج ۲ ص ۱۰۲۴، مشکوٰۃ المصابیح ج ۲ ص ۵۲۶-۵۲۷)

بیشک اس کے ساتھی ایسے ہوں گے جن کی نمازوں کے مقابلے میں تم اپنی نمازوں کو حقیر اور قلیل جانو گے اور ان کے روزوں کے مقابلے میں اپنے روزوں کو حقیر جانو گے۔ وہ قرآن (کثرت سے) پڑھیں گے مگر ان کے حلقوں سے نیچے نہیں اُترے گا۔ وہ لوگ دین سے ایسے خارج ہوں گے جیسے تیر کمان سے۔

ایک اور مقام پر انہی لوگوں کی علامات بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

السنتھم احلیٰ من السکر وقلوبھم قلوب الذیاب (ترمذی ج ۲ ص ۶۳)

ان کی زبانیں شکر سے زیادہ میٹھی ہوں گی مگر ان کے دل، بھیڑیوں کے ہوں گے۔

قرآن سے غلط استدلال کرکے گمراہ ہونے والے علماء کی بھی نشاندہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمائی ہے:۔

عن حذیفۃ ابن الیمان رض قال قال

حضرت حذیفہؓ بن یمان فرماتے ہیں۔ رسول اللہ

Marfat.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّ مِمَّا اتخوف علیکم رجل قرأ القرآن حتی اذا رؤیت بھجتہٗ علیہ وکان ردائہٗ الاسلام، اعتراہ الی ماشاءاللہ انسلخ منہ ونبذہٗ وراء ظھرہ وسعٰی علی جارہٖ بالسیف و رماہ بالشرک قال قلت یا نبی اللہ ایھما اولٰی بالشرک المرمی او الرامی قال بل الرامی

(تفسیر ابنِ کثیر، ج ۲ ص ۲۶۵)

صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے بارے میں مجھے جن اُمور کا خدشہ ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک ایسا آدمی (عالم) ہوگا جو قرآن بہت پڑھے گا۔ حتٰی کہ وہ قرآن کی رونق سے پورے طور پر سیراب ہوگا۔ اس کا اوڑھنا بچھونا بھی اسلام ہوگا۔ اللہ تعالٰے اسے کسی ایسے عیب یعنی زعم میں مُبتلا کر دے گا کہ قرآنی اثرات اس سے جُدا ہوجائیں گے۔ پھر وہ شخص قرآن کو پسِ پشت ڈال کر اپنے قرب وجوار کے مسلمانوں کو مُشرک قرار دے گا اور ان کے قتل کے درپے ہوگا۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں۔ میں نے سوال کیا۔ یارسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان دونوں میں سے فی الواقع مشرک کون ہوگا۔ مشرک کہنے والا یا وہ جس کو مشرک کہا گیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ دوسرے کو مشرک کہنے والا خود مشرک ہوگا۔

یہ حدیث مسندِ امام ابویعلٰی میں روایت کی گئی ہے۔ امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین اور دیگر ائمہ و محدثین نے اس کے راویوں کو ثقہ اور معتبر قرار دیا ہے۔ الغرض اس حدیث سے یہ امر اچھی طرح واضح ہوگیا کہ بعض لوگ قرآن پڑھنے کے باوجود قرآن سے غلط استدلال کرکے اُمتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو گمراہ اور مشرک ٹھہرائیں گے۔ حالانکہ یہی سوچ ان کی اپنی گمراہی ہوگی۔ کیونکہ باطن میں فسق ہو اور سینہ و دل انوارِ معارفِ قرآنی سے خالی ہوں تو قرآن کا مطالعہ بھی ایسے بدنصیبوں کے لیے گمراہی کا باعث بن جاتا ہے۔ اللہ تعالٰی اپنے خصوصی حفظ و امان میں رکھیں۔ (آمین)

اس حقیقت کی تائید حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جسے امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے:۔

وکان ابن عمر یراھم شرار خلق اللہ و قال انھم انطلقوا الی آیات نزلت فی الکفار فجعلوھا علی المؤمنین

(البخاری جلد ۲ صہ ۱۰۲۴)

ابنِ عمرؓ ان لوگوں کو مخلوقِ خدا میں سب سے زیادہ شریر تصوّر کرتے اور فرماتے تھے کہ یہ ان قرآنی آیات کو جو کفار و مشرکین کے حق میں نازل ہوئی تھیں بڑی آزادی اور جرأت مندی کے ساتھ مسلمانوں پر چسپاں کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا احادیث و آثار سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ ہمیشہ کچھ لوگوں کا

Marfat.com

طریق کار یہ رہا ہے کہ پہلے اپنے خودساختہ فکر اور مزعومہ مفادات کے تحت عقائد تراش لیتے ہیں اور پھر قرآنی آیات کو تاویل و تحریف کے ذریعے اپنے وضع کردہ خیالات اور نقطہ ہائے نظر پر منطبق کرنے کا نام تفسیر اور فکرِ قرآن رکھ دیتے ہیں۔ گویا خود قرآن کے تابع نہیں بلکہ قرآن کو اپنے تابع رکھنا چاہتے ہیں۔

یہی حال بنی اسرائیل کے بعض علماء کا بھی تھا۔ جن کی قرآن حکیم میں یوں مذمت کی گئی ہے:۔

وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ (البقرۃ، ۷۵)	اور بیشک ان میں ایک طبقہ ایسے لوگوں کا تھا جو کلامِ الٰہی سنتے تھے۔ پھر اسے سمجھ لینے کے بعد (معنوی طور پر) بدل دیتے تھے۔

ایسے لوگوں کو اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے آیات کی تلاش رہتی ہے اور انہیں کے حوالے سے اپنے موقف کی تائید کو خدمتِ قرآن کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ اس سلسلے میں ابوعثمان النہدی کے حوالے سے حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ بنی یربوع یا بنی تمیم میں سے ایک شخص نے آپ سے الذاریات والمرسلات والنازعات یا ان میں سے بعض کے متعلق سوال کیا' یہ استفسار ظاہراً قرآن فہمی کی خاطر ہی تھا۔ لیکن آپ نے فرمایا:۔

ضع عن راسك، فاذاله وفرة فقال عمر اما والله لو رأيتك محلوقا لضربت الذى فيه عيناك (الصارم المسلول، ۱۸۸)	اپنے سر سے کپڑا ہٹا اس نے سر ننگا کیا تو سر پر بال تھے۔ یعنی سر منڈا ہوا نہ تھا۔ آپ نے فرمایا خدا کی قسم اگر یہ سر منڈا ہوا ہوتا تو میں اسے قلم کر دیتا۔

ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ اس روایت کی اسناد صحیح ہے۔ یہاں قابلِ غور امر یہ ہے کہ اس شخص نے سوال تو قرآنِ مجید کی سورتوں کا معنی و مفہوم جاننے کے لیے کیا تھا۔ اس سے اس کا قرآنی تعلیمات اور ان کی تفہیم سے لگاؤ ظاہر ہو رہا تھا۔ لیکن سیدنا فاروقِ اعظمؓ کا ردِ عمل کچھ اور نکلا۔ وجہ یہ تھی کہ اس دور میں ایسے لوگ موجود تھے جو بکثرت قرآن پڑھتے تھے اور اس کے فہم و بیان کا دم بھی بھرتے تھے۔ لیکن ارشاداتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اربابِ بصیرت اور صحابہ کبار اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ ان لوگوں کا تمسک بالقرآن محض دھوکہ و فریب ہے۔ قرآن ان کی زبانوں پر ہے سینوں میں نہیں اور یہ اس قسم کے استفسارات خاص زاویۂ نگاہ سے کرتے ہیں۔ ان کا ارادہ کچھ اور ہوتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کی علامات بھی بیان فرما دی تھیں۔ یہ خوارج ہی تھے جو اسلام اور قرآن ہی کے نام پر ملتِ اسلامیہ کو تفرقہ و انتشار میں مبتلا کر رہے تھے ان کا مطمحِ نظر بجائے کفار و مشرکین سے برسرِ پیکار ہونے کے خود صحابہؓ تابعین اور اُمتِ مسلمہ کے سوادِ اعظم کو کافر و مشرک قرار دے کر ان سے محاذ آرائی اور قتل و غارت تھا۔ اسلام کی پہلی صدی کی تاریخ اور بالخصوص دورِ خلافتِ علیؓ کے حقائق و واقعات ان شواہد پر دلالت کرتے ہیں۔ ان کی علامات میں سے بالعموم حدیثِ نبوی کے مطابق، دھنسی ہوئی آنکھیں، اُبھرے ہوئے گال، ٹخنوں سے اُوپر تہبند، گھنی داڑھی اور سر

Marfat.com

منڈوانا تھا۔ سیّدنا عمرؓ کو اس سائل کی نسبت یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید یہ خارجی ہو۔ اس لیے اپنے خیال کی تصدیق کی خاطر اسے سر ننگا کرنے کو کہا۔ لیکن سر منڈا ہوا نہ دیکھ کر یہ خیال ہوا کہ ممکن ہے خارجی نہ ہو۔ لہٰذا یقین کے بغیر اسے قتل نہیں کیا۔ تاریخی شواہد سے یہ امر ثابت ہے کہ۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (حکم صرف اللہ تعالےٰ کا ہے) اور لَا حُجَّۃَ اِلَّا الْقُرْآن (قرآن کے سوا کوئی چیز حجّت نہیں) جیسے نعرے جو بظاہر بڑی دینی حمیّت پر دلالت کرتے ہیں۔ خود اسلام میں فتنہ و شر پیدا کرنے کے لیے لگائے جاتے رہے ہیں۔ اگر خدا اور قرآن کے نام پر تاریخِ اسلام کے دورِ اوائل میں گمراہی پھیلانے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں تو آج کئی صدیاں گزر جانے کے بعد جب کہ اخلاقی اقدار بھی زوال و انحطاط کا شکار ہو چکی ہیں ایسے فتنوں سے سادہ لوح مسلمانوں کو دامِ فریب میں کیوں مبتلا نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن سے ہدایت پانے کا حتمی طریقہ اندریں حالات یہ ضرورت زیادہ شدّت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے کہ اہلِ اسلام کو راہِ ہدایت پر گامزن ہونے اور گمراہی و ضلالت سے محفوظ رہنے کی کوئی حتمی سبیل معلوم ہونی چاہیئے۔ تاکہ وہ مختلف قسم کے دلفریب اور خوشنما دعووں سے متاثر ہو کر جگہ جگہ بھٹکتے نہ پھریں آیئے ہم قرآن سے اس اصُول اور ضابطے کو تلاش کرتے ہیں جسے اپنا کر اخذِ ہدایت کی ضمانت میسّر آجائے۔ قرآنِ حکیم اس سوال کا جواب کہ کون سی راہ راہِ ہدایت ہے؛ سورۃ الفاتحہ میں مرحمت فرماتا ہے۔ یہ وہ سورت ہے جس نے انسانوں کو ربِ ذوالعطا سے مانگنے کا طریقہ سکھایا ہے۔ اس لیے اسے سورۃ الدعا، سورۃ السؤال اور تعلیم المسئلہ بھی کہتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کی سب سے پہلی آیت جو طلبِ ہدایت اور راہِ ہدایت کی نشاندہی سے متعلق ہے اسی سورت میں ہے۔ خدا کی حمد و ثنا کے بعد انسان کو بارگاہِ ایزدی میں یہ سوال کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ — اے اللہ ہمیں سیدھی راہ دکھا۔

اب سوال یہ ہے کہ سیدھی راہ کا تعیّن کس طرح ہوگا۔ یہ کون بتائے گا کہ یہ راستہ سیدھا ہے۔ قرآن نے خود صراطِ مستقیم کی تعریف کر کے ہمیشہ کے لیے اس اُلجھن کو ختم کر دیا ہے۔

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ — ان لوگوں کا راستہ سیدھا ہے جن پر تو نے انعام کیا ان لوگوں کا نہیں جن پر غضب ہوا اور جو گمراہ ہوئے۔

یہاں صراحت کے ساتھ خدا کے مقبول اور انعام یافتہ بندوں کے راستے کو راہِ ہدایت سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے اس قرآنی وضاحت سے اختلاف کی کوئی صورت ممکن نہیں ہو سکتی، لیکن انعام یافتہ بندوں کا تعین پھر مسئلہ پیدا کر سکتا تھا۔ قرآن نے اس کو بھی یہ کہہ کر حل فرما دیا۔

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ — اور جو اللہ اور رسول کا حکم مانے اسے ان لوگوں کی معیت ملے گی جو اللہ کے انعام یافتہ ہیں اور وہ

Marfat.com

وَالشُّهَدَاءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (النساء، ۶۹)

انبیاء، صدّیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔ یہ کیا ہی اچھے رفیق ہیں۔

اس آیت میں خدا کے انعام یافتہ بندوں کو چار طبقات پر منقسم کر دیا گیا ہے۔ نبی، صدیق، شہید اور صالح، گویا نبوّت، صدیقیت، شہادت اور صالحیت یہ چار اوصاف ہیں جنہیں اللہ تعالےٰ کے خصوصی انعام کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔

لہٰذا "صراط الذین انعمت علیھم" کی قرآنی تفسیر یہ ہوئی کہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صلحاً کا راستہ چونکہ خدا کے انعام یافتہ بندوں کا راستہ ہے۔ اس لیے یہی راہِ ہدایت ہے۔ قرآنِ حکیم کے بیان سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ مذکورہ بالا چاروں طبقات کا راستہ دراصل ایک ہی راستہ ہے۔ ان میں قطعاً کوئی تفاوت اور مغائرت نہیں اور یقیناً یہی کتاب وسُنّت کا راستہ ہے۔

راہِ ہدایت کا قرآنی تشخص:-

قرآن نے اس مقام پر راہِ ہدایت کی تعریف کتاب وسنّت کے الفاظ کے حوالے سے نہیں کی حالانکہ متعدد دیگر مقامات پر اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول کے الفاظ کی صورت میں کتاب وسنّت سے تمسک و اعتصام کی تعلیم دی گئی ہے کیونکہ اسلام میں معیارِ حق وصداقت تو بلاشک وشبہ کتاب وسنّت کی راہ ہی ہے اور کسی چیز کو ان کا بدل تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہاں اہلِ اسلام کو طلبِ ہدایت کا طریقہ سکھایا جا رہا ہے اور انہیں راہِ ہدایت پر گامزن ہونے کا یقینی ضابطہ بتلانا مقصود ہے۔ یہاں بھی احکم الحاکمین صاف لفظوں میں یہ فرما سکتا تھا کہ "سیدھا راستہ میری کتاب اور میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کا ہے"۔ لیکن بجائے اس کے یہ کہا گیا کہ "سیدھا راستہ میرے انعام یافتہ اور مقبول بندوں کا راستہ ہے"۔ ذرا غور کریں تو آپ کو "صراطِ مستقیم" کی تعریف میں دو پہلو نظر آئیں گے۔ مثبت اور منفی۔

صراط الذین انعمت علیھم مثبت راہ کی نشاندہی ہے۔ جب کہ غیر المغضوب علیھم ولا الضالین منفی راہ کی۔ اس میں جامعیت بھی ہے اور مانعیت بھی۔ اس قدر تفصیل میں جانے کے بجائے صاف صاف قرآن وسُنّت کے الفاظ استعمال ہوتے تو اس میں اختصار بھی ہوتا اور ایجاز بھی، لیکن ان کا ذکر نہیں کیا حالانکہ "فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ" (صاحبِ حکمت کا کوئی کام حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا) اس میں حکمت یہ ہے کہ راہِ ہدایت ہے تو فی الحقیقت قرآن وسُنّت ہی کا راستہ لیکن قرآن وسُنّت کا صحیح مدّعا و منشا رخدا کے انعام یافتہ، مقبول اور صالح بندوں کی پیروی سے ہی معلوم ہو سکتا ہے جبکہ محض اپنی رائے سے قرآن وسُنّت کے مطالب ومفاہیم متعین کرنے میں گمراہی کا امکان پایا جاتا ہے یہی اس آیت کا منشا ہے۔ "یضل بہ کثیراً وّ یھدی بہ کثیراً" یعنی جو لوگ صرف اپنی رائے

Marfat.com

سے قرآن اور اس کی تمثیلات کو سمجھنا چاہتے ہیں گمراہ ہوجاتے ہیں اور جو اللہ کے انعام یافتہ بندوں کی رہنمائی سے سمجھنا چاہتے ہیں ہدایت پاجاتے ہیں۔

گویا ارشادِ ربانی کے مطابق قرآن سے محض اپنی رائے کی بناء پر اکتسابِ علم کرنے والے گمراہی وضلالت کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اس کی تائید اس حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ہوتی ہے:۔

من قال فی القرآن برأیہ فقد اخطا (ابوداؤد، ترمذی، نسائی) — جس نے قرآن کا مفہوم اپنی ذاتی رائے سے متعین کیا، اس نے ٹھوکر کھائی۔

اس لئے مشیّتِ ایزدی یہ تھی کہ الہامی ہدایت کے ساتھ ساتھ اس ہدایت کے مشخص نمونے بھی بنی نوعِ انسان کی طرف مبعوث کیے جائیں۔ تاکہ لوگ خدا کے پیغام کو اسی کی منشا کے مطابق سمجھ سکیں۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام کو ہدایتِ ربّانی کا کامل نمونہ بناکر مبعوث کیا جاتا رہا۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ارشادِ ربانی کا یہی مقصود تھا:۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب، ۲۱) — بے شک تمہارے لیے رسول اللہ میں پیروی کے لیے بہترین نمونۂ حیات ہے۔

بقول مولانا عبدالماجد دریابادی، حقیقی اسلام، حقیقی ایمان اور حقیقی تمسک بالکتاب بغیر کسی زندہ شخصیت کے توسط کے کیونکر ممکن ہے۔ قرآن خدا کا کلام ہے۔ باینہمہ یہ نہ ہوا کہ قرآن براہِ راست بندوں کے پاس پہنچ جاتا۔ منکرین ومومنین اسے آسمان سے اُترتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے لوگوں کو بلاواسطہ ہدایت عطا ہوجاتی۔ ہر شخص کے سرہانے صبح کو قرآن کا ایک ایک نسخہ رکھا ہوا مل جاتا لیکن قدرت نے اس کے برعکس انسانی معاشرے میں ایک زندہ شخصیّت کو پیدا فرمایا۔ اسے معاشرتی زندگی میں ہر قسم کے تعلقات رکھنے کا حکم صادر فرمایا اور پھر اس کی وساطت سے لوگوں کو ہدایت بہم پہنچائی۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو قرآنی ہدایت سمجھنے کا اہل بنانے کے لیے ان پر آیات تلاوت کیں۔ ان کا تزکیۂ نفوس کیا۔ پھر انہیں تعلیمِ کتاب دی اور حکمت ودانائی کی دولت سے نوازا۔ قرآن اس طریقۂ تعلیم وتربیت کو اس طرح بیان کرتا ہے:۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (آلِ عمران، ۱۶۴) — رسولؐ ان پر اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھتے ہیں اور ان کے قلب وباطن کا تزکیہ فرماتے ہیں اور پھر انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

صحابہ کرام کے سامنے قرآنی ہدایت کا مشخص نمونہ بھی تھا اور جملہ تفصیلات معلوم کرنے کا ذریعہ بھی۔ جسے سُنّتِ رسولؐ کہا جاتا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی کتاب وسنّت کا پیغام نسلِ انسانی تک پہنچانے کے لیے ایسے نہ کیا کہ قرآن وحدیث کے بیشمار قلمی نسخے دیگر بلاد وامصار میں روانہ فرمادیتے تاکہ لوگ براہ

Marfat.com

راست قرآن اور سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے مطالعے سے تعلیماتِ اسلام کا صحیح شعور پیدا کرلیتے بلکہ آپ نے بھی سنّتِ الٰہیہ پر عمل کرتے ہوئے مزید زندہ شخصیّات کو پیدا فرمایا۔ ان کے سینے نُورِ معرفت سے منوّر کیے انہیں اپنے نُورِ صحبت سے مُستنیر کیا۔ انہیں اپنے فیضانِ نظر سے اسلام کو سمجھنے کا اہل بنایا اور پھر اطراف واکنافِ عالم میں روانہ کردیا کہ لوگ قرآن وسُنّت کی تعلیمات ان زندہ شخصیتوں سے سیکھیں۔ یہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین جو قرآن وسُنّت کی صحیح راہ بتانے والے تھے سب کون تھے، صدیقین وصالحین تھے۔ کیا اس دَور کے مسلمان بذاتِ خود قرآن وسُنّت سمجھنے کی استعداد نہ رکھتے تھے۔ یقیناً انکی استعداد آج کے علماَ سے بہت زیادہ تھی لیکن اس کے باوجود وہ زندہ شخصیّتوں کے محتاج تھے۔ قرآن وسنّت کا علم رکھتے ہوئے بھی اکابر صحابہ واہل بیت کی خدمت میں جاتے تھے اور یہی طریقہ بعد کے ادوار میں بھی ہمیشہ جاری رہا۔ ہر دَور کے علمار قرآن وسنّت کو ہی راہِ ہدایت سمجھتے تھے۔ لیکن اس کا اصل تعیّن اور تشخّص انہیں ائمہ وصالحین اور اکابر مجتہدین کے ذریعے ہی حاصل ہوتا تھا۔

مادی علوم میں آج کونسا علم اور دستکاری کے پیشوں میں آج کونسا پیشہ ہے جس میں اُستاد کی مدد اور ماہرین کی تحقیقات وتشریحات کی ضرورت نہیں۔ کیا قرآن وسُنّت کا علم ہی ایسا رہ گیا ہے جس میں بغیر اکابر علمار محققین اور صلحار عاملین کی راہنمائی کے ہر کوئی اپنی رائے سے کلام کرتا پھرے۔ چونکہ اکابرِ ملّت اور صلحارِ اُمّت قرآن و سنّت سے ماخوذ ہدایت کے علمی وعملی نمونے تھے۔ اس لیے ان کے راستے کو قرآن نے راہِ ہدایت قرار دیا۔ جس طرح صحابہ نے قرآن کو براہِ راست اللہ تعالیٰ سے حاصل نہ کیا تھا اور نہ ہی اس کے نزول کو دیکھا تھا بلکہ انہیں اس کا حصول اور صحیح ادراک ومعرفت نمونۂ نبوّت کی وساطت سے نصیب ہوئی تھی اور جو اندیشہ ہدایتِ قرآنی کے عملی نمونے کے بغیر براہِ راست مطالعۂ قرآن سے اخذِ ہدایت کی کوشش میں موجود تھا۔ وہی اندیشہ عہدِ رسالت کے بعد قیامت تک سُنّتِ نبوی کے کامل عملی نمونوں کے بغیر تفسیر بالرائے سے بھی ممکن ہے۔ کیونکہ بعد کے اَدوار کے مسلمانوں نے بھی نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے قول وعمل اور اس کے مدعا کو براہِ راست آپ سے حاصل نہیں کیا بلکہ بصورتِ مطالعہ اس سے آگہی حاصل کر رہے ہیں۔ اسی طرح قرآن وسُنّت کے ہزاروں مسائل کا مفہوم تعبیر وتشریح کے ذریعے ہی متعین ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ کوئی ایسا ضابطہ اور اسلوب مقرر کردیا جاتا جس سے قرآنی ہدایت کا اخذ وحصول اندیشۂ ضلالت سے محفوظ ہوجائے اور اُمّتِ مسلمہ کتاب وسنّت کی ایسی تعبیرات کو اپنا سکے جو بالیقین حق وصواب ہوں۔ اس طرح قرآن نے الہامی ہدایت کا صحیح راستہ قیامت تک کے لیے متعین فرمادیا کہ ہر دَور کے مقبول اور انعام یافتہ بندے اسی راہ پر چلتے رہے ہیں۔ کیونکہ ان کا علم وعمل دراصل کتاب وسنّت کا صحیح نمونہ ہے۔ اس لیے انہی کے راستے پر چل کر قرآن سے ہدایت طلب کی جائے۔ قرآن نے یہ فیصلہ دے کر امّتِ محمدیؐ کو فکری اضطراب وانتشار کے عذاب سے نجات دلادی ہے کہ جس

Marfat.com

طرح قرآنی ہدایت اُسوۂ رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی صورت میں مشخص کر دی گئی ہے۔ اسی طرح کتاب و سنت کا راستہ اُمتِ مسلمہ کے اکابر صلحار کے راستے سے متعین و مشخص کر دیا گیا ہے۔

اس لیے فرمایا گیا۔ اے راہِ ہدایت کے متلاشیو! میرے انعام یافتہ بندوں انبیار، صدیقین، شہدآ اور صلحاً کے راستے پر گامزن ہو جاؤ۔ یہی راہِ حق پرستی ہے۔ آج بعض ذہن اس سلسلے میں ایک غلط فہمی کا شکار ہو کر یوں سوچنے لگتے ہیں کہ شاید صلحارِ اُمت کے عقائد و اعمال کا راستہ قرآن و سُنت کے راستے سے الگ ہے۔ کیونکہ اکابر ائمہ و صالحین کی تحقیقات، تعبیرات اور تشریحات سُن کر وہ یہ کہتے ہیں کہ چھوڑیئے ان کتابوں اور اقوال کو۔ صرف کتاب و سُنت کی بات کیجیے۔ یہاں اسی مغالطے کا ازالہ ضروری ہے کہ ان صلحارِ اُمت کی تعبیرات و تشریحات بھی تو کتاب و سنت ہی سے ماخوذ و مستفاد ہیں اور کتاب و سنت ہی کے احکام کی تفصیلات ہیں۔ انہوں نے کتاب و سُنت کے مقابلے میں کوئی نئی راہ نہیں دکھائی بلکہ وہ خالصتاً اسی ہدایت کے پیروکار رہے ہیں اور اسی کی اتباع سے اس کمال تک پہنچنے کے قابل ہوئے ہیں۔ قابلِ غور یہ امر ہے کہ ان صلحار عاملین کی تعبیرات کو چھوڑ کر جب ہم کتاب و سنت کی بات کرتے ہیں تو کیا ہم خود قرآن و حدیث سے مسائل کا استنباط نہیں کر رہے ہوتے؟ کیا ہم خود احکامِ قرآن و سنّت کی تعبیر و تشریح نہیں کرتے؟ کیا ہماری بحث نصوصِ قرآنی کی اشارت، دلالت اور اقتضا سے نہیں ہوتی۔ کیا ہم عصری مسائل کا حل قرآن و سنّت سے تلاش کر کے باقاعدہ آرار و خیالات کو ترتیب نہیں دیتے؟ کیا کتاب و سُنّت کی روشنی میں جو کچھ ہم درسوں تقریروں، کتابوں اور تفسیروں کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ وہ عین نصوصِ قرآن ہیں یا ان کی تعبیرات و تشریحات؟ سوال یہ ہے کہ اگر ہم کتاب و سُنّت سے روشنی حاصل کر کے ہزاروں، لاکھوں مسائل پر خیال آرائی کریں تو کیا یہ تحقیقی کام قرآن و حدیث کی راہ سے متصادم ہوگا یا اسی ہدایت کی پیروی اور خدمت متصوّر ہوگا؟ اگر قرآن و سُنّت سے ماخوذ ہمارا فکر و تحقیق قابلِ قبول ہے تو ان نفوسِ قدسیہ کے افکار و خیالات، جو سراسر قرآن و حدیث کی تعلیمات کے علمی و عملی پیکر تھے۔ کیونکر نا قابلِ قبول قرار پا گئے۔ اگر ان کی تحقیقات و تشریحات کو کتاب و سُنّت کا اصل مدعا و مفہوم سمجھنے کے لیے راہنما تسلیم کیا جائے تو آخر اس میں کیا قباحت ہے حقیقت یہ ہے کہ عقائد و اعمال کے باب میں ان کا قول و عمل اس لیے بھی وقیع اور لائقِ التفات ہے کہ وہ ہماری نسبت عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ قریب تھے اور ارشادِ نبویؐ:۔

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم

سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر ان لوگوں کا جو میرے زمانے کے لوگوں سے ملے۔ پھر ان کا جو ان لوگوں سے ملے۔

(ترمذی، ۲: ۵۴)

کے مطابق سب سے بہتر تھے اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اُمتِ محمدیؐ کے برگزیدہ اشخاص

Marfat.com

کے ذریعے کتاب و سُنّت کی ہدایت میسر نہ آسکتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ فرماتے کہ:

علیکم بسنّتی وسنة الخلفاء الراشدین المھدیین (ابوداؤد، ۲: ۲۷۹) — تم پر میری سنّت اور خلفائے راشدین کی سنّت پر عمل کرنا ضروری ہے۔

یہ امر انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ جدید عصری مسائل مثلاً سیاسی، اقتصادی، قانونی، تعلیمی اور معاشرتی تقاضوں کے مطابق جس قدر نئی اجتہادی تعبیرات قرآن و سُنّت کی روشنی میں ہوتی رہیں گی۔ اہلِ اسلام کے لیے قابلِ قبول اور قابلِ عمل ہوں گی۔ کیونکہ زندگی ارتقا پذیر ہے اور جس طرح ان مسائلِ حیات میں تحرک ہے۔ اسی طرح ان کے حل بھی بتقاضائے حالات ارتقا پذیر رہتے ہیں۔ لیکن یہ اجتہاد عقائد و عبادات کے باب میں ناجائز ہے کیونکہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی یا ارتقاء اسلام سے انحراف و ارتداد کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

لہٰذا عقائد و عبادات کے سلسلے میں سلف صالحین کی قرآنی تعبیرات و تشریحات کو ہی سند تسلیم کیا جائے گا۔ ایک اور مقام پر قرآن اور ہدایت کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے اس سے ہدایت حاصل کرنے کے طریقہ کی نشاندہی ان الفاظ میں کی گئی ہے:۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ (المائدۃ، ۵: ۱۵-۱۶) — بیشک تمہارے پاس ایک نُور یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ایک روشن کتاب یعنی قرآن آگیا۔ اس سے اللہ تعالےٰ اسی کو ہدایت دیتا ہے جو اس کی رضا کی پیروی کرتا ہے۔

گویا قرآن کا یہ برملا اعلان ہے کہ رضائے الٰہی کی پیروی کرنے والے بہرصورت وعدۂ ایزدی کے مطابق ہدایت سے سرفراز کیے جاتے ہیں۔ چونکہ مقامِ راضیہ و مرضیہ پر فائز مقدس نفوس بارگہِ اُلوہیت سے بہرصورت ہدایت کی نعمت پاتے ہیں اس لیے ان کے راستے کی پیروی بھی ہدایت بن جاتی ہے اور انہی سے فکری و عملی وابستگی قرآنی ہدایت کے حصول کی ضمانت بھی مہیا کرتی ہے۔ مزید برآں اس امر کے یقین اور وثوق کی بنیاد ایک اور حکمِ قرآنی بھی ہے جہاں شیطان کے سجدۂ آدم سے انکار پر جنّت سے نکل جانے کے فیصلے کا بیان ہے۔ اس موقع پر قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:۔

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (الزمر، ۸۲) — ابلیس نے کہا۔ باری تعالیٰ تیری عزّت کی قسم ان سب لوگوں کو گمراہ کروں گا۔ سوائے تیرے ان بندوں کے جو برگزیدہ اور چُنے ہوئے ہیں۔

یہاں متذکرہ بالا حقیقت کی صراحت کر دی گئی ہے کہ خدا کے مقبول و برگزیدہ بندے اللہ تعالےٰ کے

Marfat.com

خصوصی فضل و احسان سے ہمیشہ گمراہی سے محفوظ و مامون رہتے ہیں اور بنی نوعِ انسان کو راہِ ہدایت سے بھٹکانے کے تمام حیلے اور بہانے صالحین و مخلصین پر ناکام ہو جاتے ہیں۔ چونکہ انہیں رب العلمین کی طرف سے خصوصی امان اور حفاظت میں رکھا جاتا ہے۔ اس لیے ان کی فکری، علمی، اعتقادی اور عملی رہنمائی میں قرآن سے ہدایت اخذ کرنا ہی طلبِ ہدایت کا صحیح طریقہ ہے۔

لفظِ قرآن کا تیسرا مادۂ اشتقاق ۔ قرأۃ

ائمہ لغت کا تیسرا قول یہ ہے کہ لفظِ قرآن کا مشتق منہ "قرأۃ" ہے جس کا معنی پڑھنا ہے۔ اس لحاظ سے قرآن فعلان کے وزن پر اسم مصدر مہموز قرار پایا۔ چنانچہ اس کا معنی "پڑھا گیا یا پڑھایا گیا" ہوگا۔ لغت کے مشہور امام ابوالحسن علی بن حازم اللحیانی اسی قول کی تائید کرتے ہیں جسے امام جلال الدین سیوطیؒ نے الاتقان میں رقم فرمایا ہے۔ قرأۃ کا مادہ بھی دراصل قرأ ہی ہے جو اکٹھا کرنے اور جمع کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ المفردات میں قرءًا و قرأۃً کا مفہوم واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

انه لا یقال للحرف الواحد — قرءً یا قرأۃً ایک حرف کے پڑھنے کو نہیں کہتے۔

قرأت کا اطلاق کئی حروف اور کلمات کو ملا کر پڑھنے پر ہوتا ہے اس لیے قرأۃ کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

القرأۃ ضم الحروف والکلمات بعضها الی بعض فی الترتیل (المفردات: ۴۰۲) — حروف اور کلمات میں سے بعض کو بعض کے ساتھ ملا کر پڑھنا قرأۃ کہلاتا ہے۔

قرآن حکیم اسی مفہوم کو اپنے لفظوں میں اس طرح ادا کرتا ہے۔

اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ — بیشک اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھنا ہمارے ذمے ہے۔ پس جب ہم اسے پڑھ چکیں تو پھر اس پڑھے ہوئے کی پیروی کیجیے۔

(القیامہ: ۱۷-۱۸)

امام رازی نے "تفسیر کبیر" میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے جس سے اس تصور کی تائید ہوتی ہے۔

ان القرآن والقرأۃ واحد کالخسران والخسارۃ — لفظ قرآن اور قرأۃ اصل میں ایک ہی چیز ہیں جیسے خسران اور خسارہ۔

علامہ زمخشری نے تفسیر کشاف" میں یہ بیان کیا ہے کہ لفظِ قرآن لغت میں مصدر ہے اور قرأۃ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً قرأت الکتاب قرآناً "(میں نے کتاب کو خوب اچھی طرح پڑھا)

یہاں ایک اور پہلو انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ لفظِ قرآن کے وزن پر آنے والے تمام مصادر میں ہمیشہ مبالغہ اور معنی کی کثرت پائی جاتی ہے۔ مثلاً رحم سے رحمان ہے جس کا معنی صرف "رحم کرنے والا نہیں بلکہ بہت زیادہ رحم فرمانے والا ہے" اس میں معنی رحمت کی کثرت اور مبالغہ موجود ہے۔ اسی طرح غضب سے غضبان اور عطش سے عطشان ہے جن کے معنی علی الترتیب بہت زیادہ غضبناک اور شدید پیاسا کے آتے ہیں۔ چنانچہ قرأۃ سے قرآن کا فعلان کے وزن

Marfat.com

پر وارد ہونا کثرتِ قرأت کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔

بنا بریں قرآن سے مراد "وہ کتاب ہے جسے بہت زیادہ پڑھا جائے۔" جب ہم لفظِ قرآن کی معنوی حقیقت کو تاریخی شہادت کے پیمانے پر پرکھتے ہیں تو اسکی صداقت روزِ روشن کی طرح آشکار ہو جاتی ہے۔ کوئی بھی سلیم الطبع شخص اس حقیقت کا انکار نہیں کرسکتا کہ تاریخ عالم کے آغاز سے آج تک کوئی الہامی یا غیر الہامی کتاب اس قدر کثرت سے نہیں پڑھی گئی جتنا کہ قرآنِ مجید۔

قرآن مجید حفظ و ناظرہ، تجوید و قرأت، تلاوت و ترجمہ اور تفسیر و تعبیر کے لحاظ سے اس قدر کثرت سے پڑھا اور پڑھایا جارہا ہے کہ اس سے بڑھ کر اس کی حقانیت پر کسی اور خارجی دلیل کی حاجت ہی نہیں رہتی۔ یعنی اس کتاب کا نام رکھنے میں جو منشاء الٰہی کارفرما تھا اس کی واقعیت کا نظارہ آج دنیا کا ہر شخص اپنی آنکھوں سے خود کرسکتا ہے۔ معنوی کثرت اور مبالغہ و تکرار کا جو رنگ ہمیں قرآن کے نام میں دکھائی دیتا ہے۔ وہی رنگ باری تعالےٰ نے صاحبِ قرآن صلے اللہ علیہ وسلم کے نام کو عطا کیا ہے۔

قرآن کی طرح لفظِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم میں بھی معنوی کثرت اور مبالغہ و تکرار پایا جاتا ہے۔ ائمہ لغت و ادب نے لفظ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے معنی بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

مُحَمَّدٌ الَّذِی کَثُرَتْ خصالہ المحمودۃ (المفردات، محیط المحیط)

محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اس ذات کو کہتے ہیں جس کے اوصاف حمیدہ بے شمار ہوں

اسی طرح کہا گیا ہے۔

ومنہ مُحَمَّد کانہٗ حُمِدَ مرّۃً بعد مرّۃٍ قلت الی مالا نہایۃ لھا" (المظہری ۲: ۱۴۷)

اور حمد سے ہی لفظ محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نکلا ہے، کیونکہ آپ کی بار بار اتنی کثرت سے تعریف کی گئی ہے کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں۔

امام بغویؒ لکھتے ہیں۔

محمد ھو المستغرق لجمیع للحامد

محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ ہستی ہے جو تمام محاسن و کمالات اور محامد و تعریفات سے معمور ہے

سیدنا حسان بن ثابتؓ نے لفظِ محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کیا خوب شرح کی ہے۔

ألم تران اللہ ارسل عبدہٗ ببرھانہ واللہ اعلیٰ وامجد

وشقّہٗ من إسمہ لیجلہٗ فذو العرش محمودٌ وھذا محمد

(کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے برگزیدہ بندے کو اپنی کامل ترین دلیل کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ حالانکہ وہ خود سب سے برتر و برگزیدہ ہے۔ اور اس نے اپنے بندے کا نام اپنے مقدس نام میں سے نکالا تاکہ وہ بھی بکثرت تعریف ہوسکے پس عرش والا خود محمود ہے اور یہ محمدؐ ہے (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم)

لفظِ قرآن اور لفظِ محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معنوی جائزہ اس امر کی واضح نشاندہی کر رہا ہے کہ قرآن اور صاحبِ قرآن

Marfat.com

دونوں کا تذکرہ ابدالآباد تک کائنات میں جاری و ساری رہے گا۔ یہ دونوں نام اور ذکر باہم لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں لفظی اور معنوی مماثلت جہاں اپنی جگہ ایک زندہ اور دائمی معجزے کا درجہ رکھتی ہے وہاں خود اپنی صداقت و حقانیت پر معروضی شہادت بھی پیش کر رہی ہے کیونکہ کائناتِ ہست و بود میں نہ قرآن سے بڑھ کر کسی کتاب کا پڑھا جانا ثابت ہے اور نہ حضرت محمد ﷺ سے بڑھ کر کسی انسان کا چرچا اور تذکرہ ثابت ہے۔

قرآن کا قرأت سے یہ تعلق اس پہلو سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ باری تعالیٰ نے سب سے پہلی قرآنی وحی حکمِ قرأت کی صورت میں نازل فرمائی۔ یہاں ایک اور امر نہایت غور طلب ہے کہ قرأت کا مادہ بھی حقیقت میں قرا ہے۔ اور علامہ زرکشیؒ اس ضمن میں بعض متاخرین کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

اِنّما مادتہ "قرأ" بمعنی اَظْھَرَ وَبَیَّنَ،	اس کا مادہ (قرا) ہے جس کا معنی ظاہر کرنا اور اجاگر کرنا ہے۔
والقاری یُظْھِرُ القرآنَ وَیُخْرِجُہٗ۔	قاری کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے کہ وہ قرآنی آیات کو منہ سے نکالتا اور ظاہر کرتا ہے۔

(البرھان، ۱: ۲۷۷)

اسی طرح وقت کو بھی "قرء" کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسی حقیقت (REALITY) ہے جو ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس کا ظاہر ہونا ایک امر لابدی ہے جسے مخفی رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ گویا وقت اپنے وجود پر خود دلیل ہوتا ہے۔ اسے اپنے ثبوت کے لیے کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس اعتبار سے قرآن کا یہ معنیٰ ہوا کہ وہ کتاب جو اپنی صحت اور حقانیت پر خود دلیل ہو، چنانچہ قرآن اپنی ذات میں اس قدر واضح، غیر مبہم، ظاہر، روشن اور بیّن ہے کہ اسے اپنے دعوے کی صحت و حقانیت پر کسی خارجی دلیل کی حاجت نہیں۔ یہ خود اپنے دعوے پر دلیلِ قاطع ہے اسی لیے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

الٓرٰ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ	الرا۔ یہ روشن اور واضح کتاب کی آیتیں ہیں

(یوسف: ۱)

سورۂ نساء میں اس تصور کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا (النساء: ۱۷۴)	اور ہم نے آپ کی طرف واضح نور بھیجا۔

نور خود روشنی کو کہتے ہیں لیکن اسے پھر "مبین" یعنی واضح اور روشن قرار دینے کا مقصد اس حقیقت کو آشکار کرنا ہے کہ قرآن ایسا نور ہے جسے اپنے ثبوت پر کسی مغایر دلیل کی ضرورت نہیں بلکہ یہ از خود دعوے بھی ہے اور دلیل بھی۔ یہی مفہوم لفظ "القرآن" کے چوتھے ماخذ سے بھی مستفاد ہے۔

لفظ قرآن کا چوتھا ماخذ "القرائن"

ابو زکریا یحییٰ بن زیاد الفراء الکوفی جو معروف ائمہ نحو میں سے ہیں، کے مطابق لفظِ قرآن غیر مہموز ہے اور القرائن سے مشتق ہے۔ علامہ قرطبیؒ اسی قول کی تائید کرتے ہیں۔ علامہ واحدی بیان کرتے ہیں کہ ابن کثیر قرآن کا لفظ بغیر ہمزہ کے پڑھتے تھے۔ اسی طرح امام بیہقیؒ کا ایک قول امام شافعیؒ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ بھی القرآن کو غیر مہموز پڑھتے تھے۔

القرائن قرینہ کی جمع ہے۔ جس کے معنی علامت، نشان اور دلیل کے ہیں۔ چنانچہ اس مقدس کتاب کو قرآن

Marfat.com

اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی ہر آیت دوسری آیت کے مدّعا و مفہوم کی صحت کا قرینہ ہے۔ گویا قرآن اپنے ہر دعوے کی صداقت و حقانیت کی دلیل بھی خود ہی فراہم کرتا ہے اسے اپنے بیان کی تصدیق کے لیے بنیادی طور پر خارجی قرائن کی احتیاج نہیں ہوتی۔ یہ اعجاز صرف قرآن مجید کا ہے کہ یہ خود ہی اپنے دعوے کی دلیل ہے۔ ورنہ دیگر کتب و صحائف سماوی کی صداقت کا اظہار انبیاء علیہم السلام کے حسّی معجزات کے ذریعے ہوا کرتا تھا۔ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر نازل ہونے والی ابدی کتاب دونوں کا یہ منفرد اعجاز ہے جو کسی اور کتاب اور صاحب کتاب کو حاصل نہیں ہو سکا۔ سابقہ انبیاء علیہم السلام دعوائے نبوت کرتے تو اُن کے دعویٰ کی دلیل ان کے حسّی معجزات ہوتے جو انہیں صحتِ نبوّت کے قرینہ کے طور پر عطا کیے جاتے تھے۔ اسی طرح ان پر جو وحی کی جاتی اس کا احقاق بھی ارہاصات و معجزات کے ذریعے منصۂ شہود پر آتا۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منجملہ دیگر خصائص و امتیازات کے یہ اعجاز بھی عطا کیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات خود ہی اپنے دعوائے نبوت کی دلیلِ اتم قرار پائی اور آپ کی کتاب کا ایک ایک لفظ بھی خود اپنے دعوے کی دلیل ٹھہرایا گیا۔

چنانچہ کتاب اور صاحبِ کتاب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں اپنی اپنی جگہ ایسے اکمل و اتم معجزے بنا دیئے گئے کہ انہیں اپنے مدّعا کی صداقت و حقانیت کے لیے اصلاً کسی اور معجزے کی حاجت ہی نہ رہی۔ اس حقیقت کو قرآن ان الفاظ میں بیان کر رہا ہے۔

يَآاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا۔ (النساء: ۴:۱۷۴)

اے بنی آدم بیشک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے سب سے زیادہ مضبوط اور اٹل دلیل آگئی اور ہم نے تمہاری طرف روشن نور نازل فرمایا۔

بُرہان سے مُراد آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے اور نورِ مبین سے مراد قرآن حکیم۔ امام راغب اصفہانیؒ البرہان کا معنی اس طرح بیان کرتے ہیں:

البرهان اوكد الادلّة وهو الذى يقتضى الصدق ابدًا" (المفردات: ۴۵)

برہان سب سے زیادہ مضبوط دلیل کو کہتے ہیں جو ہمیشہ سچائی پر ہی دلالت کرتی ہے۔

برہان ایسی حتمی شہادت اور قطعی دلیل (FINAL & CONCLUSIVE EVIDENCE) ہوتی ہے کہ اس کے آجانے کے بعد کسی قسم کے عذر و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی البرہان کا معنی درج ذیل الفاظ میں بھی کیا گیا ہے۔

الدليل القاطع للعذر والحجة المزيلة للشبه۔

(البرھان سے مراد) ہر عذر کو ختم کرنے والی دلیل اور تمام شبہات زائل کرنے والی حجت ہے۔

امام خازن اپنی تفسیر "لباب التاویل فی معانی التنزیل" میں فرماتے ہیں:

البرهان دليل على اقامة الحق وابطال الباطل والنبى كان كذالك لانه تعالىٰ جعله حجة قاطعة قطع به عذر

برہان احقاقِ حق اور ابطالِ باطل پر دلیل قطعی کا نام ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی شان کے مالک تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسی حجتِ قاطعہ بنایا تھا جس سے تمام

جمیع الخلائق۔ (الخازن، ۱: ۴۵۶) مخلوقات کے عذر ختم کر دیے گئے۔

اسی لیے جب رسولِ محتشم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے توحید و رسالت کا اعلان فرمایا تو دنیائے کفر کے سامنے دعویٰ توحید اور اعلانِ رسالت کی صداقت کے اثبات میں آپ نے جو سب سے پہلی اور آخری دلیل پیش کی وہ خود آپ کی ذاتِ گرامی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (یونس: ۱۶)

میں نے تمہارے درمیان ایک عمر گزاری ہے (یعنی زندگی کے چالیس برس) پس تم غور کیوں نہیں کرتے۔

چنانچہ حضور علیہ السلام نے اپنی نبوّت و رسالت کا دعویٰ سب سے پہلے اپنی سیرت و کردار کی دلیل کے ساتھ عالمِ انسانیّت کے سامنے پیش کیا۔ روزِ اوّل سے آج تک نہ وہ بے مثال دلیل رد ہو سکی اور نہ اس دعوے کا ابطال ہو سکا۔

یہی انفرادیت اس پیغمبرِ برحق صلے اللہ علیہ وسلم کی کتاب کو بھی حاصل ہوئی کہ یہ خود اپنے دعوے کی ایسی دلیل تھی جسے تاریخ عالم میں ہزاروں سازشوں اور تنقیدی کاوشوں کے باوجود رد نہیں کیا جا سکا۔ گویا کتاب اور صاحبِ کتاب دونوں اتحادِ دعوٰے و دلیل کے ایسے شاندار مظہر ہیں کہ ان کی نظیر عالمِ امکان میں ناپید ہے

قرآنی دعویٰ کیا ہے؟

قرآن اپنی نسبت تین پہلوؤں پر مشتمل دعویٰ کرتا ہے۔

ایک یہ کہ یہ کتاب کسی فرد کی تصنیف نہیں بلکہ خود خلاّقِ عالم کی نازل کردہ ہے۔ اس کے الفاظ اور معانی سب کچھ الہامی اور منزّل من اللہ ہیں۔

دوسرے یہ کتاب اور اس کے جملہ مشمولات حق ہیں جو کچھ اس سے متصادم ہو وہ باطل ہے۔

تیسرے اس کتاب کی اطاعت دنیا و آخرت کی فوز و فلاح کی ضامن ہے اور اس کے آفاقی اصولوں سے انحراف تباہی و ہلاکت کا باعث ہے۔

(۱) اپنے دعوے کے پہلے حصّے کا ذکر قرآن یوں کرتا ہے:

وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ (الشعرآء: ۱۹۲) اور بے شک یہ قرآن رب العالمین کا نازل کردہ ہے

سورۃ السجدہ میں ارشادِ باری تعالےٰ ہے۔

تَنزِيلُ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِن رَّبِّ الْعَالَمِينَ (السجدہ: ۲) یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں۔

ایک اور مقام پر ارشادِ ربانی ہے۔

وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا ۔ (الشوریٰ: ۷) اور اے محبوب اسی طرح ہم نے تیری طرف عربی زبان میں قرآن کی وحی کی ہے۔

سورۂ یوسف میں مذکور ہے:

Marfat.com

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (یوسف: ۲)

بیشک ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا تاکہ تم سمجھ سکو۔

سورۃ الشعراء میں یہی امر مزید صراحت کے ساتھ یوں بیان کیا گیا ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (الشعراء: ۱۹۳-۱۹۵)

اس قرآن کو روح الامین (جبرئیل) لے کر اترے آپ کے دل پر تاکہ آپ ڈر سنانے والوں میں ہوں۔ یہ قرآن روشن عربی زبان میں اتارا گیا۔

اگر نزولِ قرآن صرف معانی کی صورت میں ہوتا تو وحی کو "عربیت" سے موصوف نہ کیا جاتا۔ وحی قرآنی کو عربی زبان میں نازل کیے جانے کا بیان اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن کلامِ نفسی اور کلامِ لفظی دونوں کا نام ہے کیونکہ عربیت کلام کے معنی و مفہوم کی نہیں بلکہ الفاظ کی صفت ہے۔

اس دعوے میں شرف و امتیاز کا پہلو یہ ہے کہ سابقہ الہامی کتب اور آسمانی صحائف اکثر معانی و مطالب کی صورت میں نازل کیے گئے ان کے الفاظ منزّل من اللہ نہ ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں کے الفاظ محفوظ نہ رہ سکے اور وہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ حذف و اضافہ اور تحریف و ترمیم کا شکار ہو گئے۔ لیکن قرآن اپنی صورت و معنویت دونوں کے اعتبار سے الہامی تھا۔ کسی مخلوق کا فرمودہ یا مصنفہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ آج تک محفوظ رہا اور ابدالاباد تک محفوظ رہے گا۔

(۲) قرآنی دعوے کا دوسرا حصہ اس طرح مذکور ہے:

اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ (محمد: ۲)

جو کچھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا وہ اس پر ایمان لائے یہی ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔

اس بیان میں حصر ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ حق صرف یہی ہے اور جو کچھ اس سے مختلف یا متضاد ہو وہ باطل ہے

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے:

اِنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (الانعام: ۱۱۵)

بے شک یہ قرآن تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔

یہاں یہ پہلو بڑی صراحت کے ساتھ واضح کر دیا گیا ہے کہ قرآن کی پیروی حق ہے اور اس کے ماسوی کی باطل۔ یہ امر بھی ذہن نشین رہے کہ انبیاء و علماء کی پیروی قرآن ہی کی پیروی ہے اسے ماسوی کے زُمرے میں تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وضاحت ہدایتِ قرآنی کے موضوع کے آخری حصے میں آچکی ہے۔ یہاں باطل سے مراد محض اس شئے کی پیروی ہے جس سے قرآن کا انکار و انحراف لازم آئے۔

(۳) قرآنی دعوے کا تیسرا حصہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (الاسراء: ۹)

بیشک یہ قرآن کامیابی و کامرانی کی مضبوط منزل تک پہنچاتا ہے اور اہلِ ایمان کو خوش خبری دیتا ہے۔

Marfat.com

گویا قرآن نے اپنی اطاعت کے نسبے دنیا و آخرت کی تمام کامیابیوں کو پالینے کی ضمانت بھی عطا کی ہے۔

یہ تھا قرآنی دعویٰ جو اس نے اپنے منزل من اللہ، حق و صداقت پر مبنی اور فوز و فلاح کا ضامن ہونے کی نسبت بار بار کیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قرآنی دعویٰ کی صحت و حقانیت کی دلیل کیا ہے؟

قرآنی دعویٰ کی دلیل

ہر چند کہ قرآنی دعاوی کی صداقت و حقانیت پر دلالت کرنے والی لاکھوں شہادتیں عالم آب و گل میں معرض ظہور میں آتی رہی ہیں اور تاریخ اسلام کے اوراق ان شواہد و حقائق سے مزین ہیں لیکن جس طرح ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ قرآن خود اپنے دعویٰ کی صحت پر قطعی دلیل ہے۔ اس لیے ہم خارجی شہادات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے خود قرآن کے داخلی قرائن پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں تاکہ اسی کے دامن سے اس کے دعویٰ کی تصدیق میسر آئے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ
(العنکبوت: ۵۱)

قرآنی دعاوی و احکام کی صحت پر دلیل طلب کرنے والوں کے لیے کیا یہی کافی نہیں کہ ہم نے جو کتاب آپ پر نازل کی ہے اور جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے بےشک اسی میں ایمان والوں کے لیے رحمت اور تنبیہ و عبرت موجود ہے۔

اگر اس آیت کے بیان پر غور فرمائیں تو معلوم ہو جائے گا کہ قرآن خود کو نقادانِ عالم اور معترضین اسلام کے سامنے بطور چیلنج پیش کر رہا ہے اور پکار پکار کر دعوت دے رہا ہے کہ پیغامِ محمدی سے انحراف کرنیوالو! اگر وحیِ الٰہی کی صداقت و حقانیت پر تمہیں کوئی حتمی دلیل اور شہادت مطلوب ہو تو آؤ یہ قرآن خود ہی دلیل ہے۔ مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے اس صحیفۂ ہدایت کا جائزہ لو اور دیکھو کیا اس دلیل کا کوئی پہلو ایسا بھی ہے جس پر انگشتِ اعتراض بلند کی جا سکے؟ کیا اس کی عظمت و کمال اور حسن و جمال کا کوئی گوشہ عیب دار بھی ہے؟ اگر یہ دلیل ہر نقص سے منزہ و مبرا ہے اور اس کی حتمیت و قطعیت ہر لحاظ سے غیر مشکوک ہے تو پھر اس کے ہر دعویٰ کی صحت اور صداقت پر ایمان لے آؤ۔

قرآن چونکہ قیامت تک کے ہر دور کے لیے صحیفۂ ہدایت بنایا گیا ہے۔ اس لیے اس کی دلالت بھی زمانی اور مکانی حدود سے بالاتر رکھی گئی ہے۔ قرآن نے اپنی حقانیت پر ایسے دلائل قائم کیے ہیں جو ہر طبقہ کے انسانوں کے حسب حال ہیں۔ مختلف انسانوں کا ذہنی فرق و امتیاز ان کے عقل و فہم کا قدرتی تفاوت اور اس کے مقتضیات ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے جس کا انکار نہیں ہو سکتا اور یہ امر بھی مسلمات میں سے ہے کہ انسانی طبیعت کی افتاد کچھ ایسی ہوئی ہے کہ جب تک وہ اپنی سمجھ اور ذہنی استعداد کے مطابق دلیل نہ پائے۔ دعوے تسلیم نہیں کرتی، بنابریں قرآن کریم میں ان سب دلائل کو جمع کر دیا گیا ہے جن کی کسی بھی انسان کو قیامت تک کبھی ضرورت ہو سکتی تھی۔ پھر لطف یہ ہے کہ مختلف دلائل کا انکشافِ تام خواص کے علاوہ ہر دور کے عامۃ الناس پر اپنے اپنے وقت پر حسب ضرورت ہوتا رہا ہے۔

Marfat.com

قرآنی صداقت کے داخلی قرائن

قرآن نے اپنے دعویٰ پر مختلف انواع و اقسام کے دلائل قائم کیے ہیں جو اس کی صداقت و حقانیت کے قرائن ہیں۔

انہیں فنی اصطلاح میں "وجوہِ اعجاز القرآن" بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

۱۔ عدمِ مثلیت ۲۔ حفاظت اور کاملیت و تمامیت ۳۔ عدمِ اختلاف و تناقض ۴۔ ندرتِ اسلوب و نظمِ کلام ۵۔ فصاحت و بلاغت ۶۔ صوتی ترنم و تغنم ۷۔ احوالِ غیب کا بیان ۸۔ تسخیر کی ضمانت ۹۔ اُمیتِ صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اس موضوع پر جاحظ، جرجانی، واسطی، خطابی، رمانی، رازی، ابنِ سراقہ، باقلانی، اور ابن العربی وغیرہم نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔ امام سیوطیؒ نے 'الاتقان'، ابن حزم نے 'الفصل فی الملل والنحل'، زرکشی نے 'البرہان'، شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے 'الفوز الکبیر' اور زرقانی نے 'مناہل العرفان' میں تفصیل سے کلام کیا ہے۔ دورِ جدید کے مصنفین میں سے سید رضا، سید قطب اور مصطفےٰ صادق الرافعی وغیرہم نے اس موضوع کے بعض گوشوں پر فنی گفتگو کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے تمام ائمہ و علماء کی توجیہات اپنی اپنی جگہ پر قرآن مجید کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کو نمایاں کرتی رہی ہیں۔ ان وجوہ کا تعدد باہمی تعارض کا باعث نہیں۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ کوئی حسن و جمال کا پیکرِ اتم اگر چند مختلف الذوق لوگوں کے سامنے جلوہ گر ہو جائے تو ہر شخص دادِ نظارہ دیتے ہوئے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس حُسن کے وجوہِ اعجاز پر روشنی ڈالے گا۔ کوئی تناسبِ اعضاء پر فریفتہ ہوگا۔ کسی کو رنگ و زینت پر شیفتگی ہوگی کوئی قدو قامت کی موزونیت پر نثار ہوگا۔ کوئی گیسوئے عنبریں کا اسیر ہوگا، کوئی چشمِ نرگسی میں ڈوب رہا ہوگا اور کوئی جمالِ آتشیں کی فسوں کاریوں سے متاثر ہوگا۔ الغرض جب حسنِ کامل اور جمالِ اتم ہوگا تو اس کی ہر ہر ادا مشتاقانِ دید کو دعوتِ نظارہ دے گی اور اہلِ نظر کو ہر ہر قدم پر "جا ایں جاست" کا سماں نظر آئے گا اور وہ وہیں محوِ حیرت ہو جائیں گے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ قرآن کے اسی اعجازِ حُسن کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

زفرق تا قدمش ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

تعبیراتِ تشریحات اگرچہ مختلف ہوں، اندازِ بیاں بھی بیشک بدلے ہوئے ہوں لیکن یہ سب اسی ایک حُسنِ تمام کی جلوہ پاشیاں ہی ہیں۔

عبارتنا شتی وحسنک واحد — وکل الی ذاک الجمال یشیر

عدمِ مثلیت

قرآن نے اپنے دعویٰ کی صحت و حقانیت کی دلیل اپنی عام مثلیت کو قرار دیا ہے اور عالمِ انس و جان کو مخاطب کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ اس کلام کے منزل من اللہ اور نبی برحق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ساری مخلوقات اپنی اجتماعی کوششوں کے باوجود اس کا مثل لانے سے قاصر ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا

(بنی اسرائیل: ۸۸)

اے محبوب تو فرما دے کہ اگر تمام انسان اور جن اس قرآن کا مثل لانے پر متفق ہو جائیں تب بھی وہ اس کا مثل نہیں لا سکتے۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہی بن جائیں۔

Marfat.com

دوسرے مقام پر مخالفین کو فرمایا گیا کہ پورے قرآن کا مثل لانا تو درکنار قرآن کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا پردازی کرنے والے اپنے قول کی تائید میں صرف دس سورتوں کی ہی مثل لے آئیں۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ (ہود: ۱۳)

کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہی قرآن گھڑ لیا ہے تو کہہ دے کہ اچھا تم اس طرح کی گھڑی ہوئی دس سورتیں ہی لے آؤ۔

لیکن اس پر بھی معترضین بے بس رہے تو باری تعالیٰ نے ایک اور چیلنج کیا۔

اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ (البقرہ: ۲۳)

اگر تمہیں کوئی شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے خاص بندے پر نازل کیا تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے تمام حمایتیوں کو بلا لو اگر تم سچے ہو۔

اس کے بعد ابدالاباد تک کے لیے اس امر میں پورے عالم کفر کی ناکامی کا بیان کیا گیا ہے۔ جس کی شہادت چودہ سو سال کی تاریخ دے رہی ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ (البقرۃ: ۲۴)

پھر اگر تم قرآن کی ایک سورت کی مثل بھی نہ لا سکو اور تم ہرگز نہ لا سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں جو تیار رکھی ہے کافروں کے لیے۔

اس قرآنی دلیل کی صداقت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ عالم یہودیت اور عالم عیسائیت اسلام کے خلاف کس حد تک برسرِ پیکار رہے ہیں۔ تاریخ کا ہر طالب علم اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہے اور آج بھی اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کتنی کوششیں مغربی و اشتراکی اساطین کے ذریعے دنیا میں ہو رہی ہیں۔ اہلِ بصیرت سے مخفی نہیں لیکن ان بھرپور مخاصمانہ کاوشوں کے باوجود آج تک قرآن کی کسی ایک سورت یا آیت کی مثل نہیں بنائی جا سکی۔ اگر اس کے الہامی ہونے کا دعویٰ غلط ہوتا تو اس کے مماثل کئی نسخے معرضِ وجود میں آ چکے ہوتے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد عالمِ عیسائیت میں انجیل کے ۱۳۲ نسخے رواج پا چکے تھے۔ جن میں سے بالآخر ۱۲۹ کو رد کر کے بقیہ چار کو سندِ صحت عطا کر دی گئی۔

آج بھی انجیلِ یوحنا، انجیلِ مرقس، انجیلِ لوقا، انجیلِ متی کے نام سے چار مختلف نسخے موجود ہیں اور پوری دنیائے عیسائیت ان میں سے کسی ایک پر متفق نہیں ہو سکی۔ اس کے برعکس اسلام کے خلاف اندرونی اور بیرونی سطح پر لاکھوں سازشیں ہوئیں۔ لیکن قرآن کا عدمِ مثلیت کا وصف اسی طرح برقرار رہا اور آج بھی تقریباً ایک ارب افراد پر مشتمل ملتِ اسلامیہ صرف ایک ہی متن کو قرآن مانتی ہے اور اس امر میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا بلکہ صفحۂ ہستی پر آج تک قرآن کا کوئی متبادل نسخہ پیش نہیں کیا جا سکا۔ بعض جھوٹے مدعیانِ نبوت نے جزوی طور پر ایسی جسارت کرنا چاہی لیکن ہمیشہ خاسر و خائب ہوئے اسی طرح اگر کسی اور نے بھی قرآن کی عظمتِ اعجاز کو نہ سمجھتے ہوئے ایسا اقدام کیا تو وہ بھی ناکام و نامراد ہی رہا۔

Marfat.com

ابن جوزیؒ "الوفا فی فضائل المصطفٰے" میں امام ابن عقیل کے حوالے سے ابو محمد بن مسلم نحوی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ اعجاز القرآن پر گفتگو کر رہے تھے وہاں ایک فاضل شیخ بھی موجود تھا۔ اُس نے کہا کہ قرآن میں ایسی کون سی ندرت و کمال ہے جس سے فضلاء، بلغا عاجز آجائیں۔ پھر وہ کاغذ قلم لے کر بالاخانے پر چڑھ گیا اور وعدہ کیا کہ تین دن کے بعد قرآن مجید کی مثل کچھ لکھ کر لاؤں گا۔ جب تین دن گزر گئے اور وہ نیچے نہ اُترا تو ایک شخص بالاخانے پر چڑھا تو اُسے اس حال میں پایا کہ اس کا ہاتھ قلم پر سوکھ چکا تھا۔ ایسے واقعات "فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا" (پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو اور تم ہرگز ایسا نہ کر سکو گے) کی زندہ شہادتیں ہیں۔

۲۔ حفاظت اور کاملیت و تمامیت

قرآنی حقانیت کا دوسرا قرینہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ بھی خود ہی فرمایا ہے۔

"اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" (الحجر: ۹)

بیشک یہ قرآن ہم نے ہی نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

چنانچہ وعدۂ الٰہی کے مطابق قرآن آج تک ہر قسم کی کمی بیشی اور حذف و اضافہ سے محفوظ رہا ہے۔ اس لیے یہ کامل بھی ہے تمام بھی۔ عہدِ رسالت میں جب قرآنی آیات متعدد اشیاء پر معرضِ تحریر میں لائی جاتی تھیں اور مکمل طور پر محررہ اور مرتب شدہ کوئی جلد موجود نہ تھی۔ اس دور میں بھی پورا قرآن تحریری طور پر موجود و محفوظ تھا اور خود نبی اکرم کے علاوہ کئی صحابہ بھی قرآن کے حافظ تھے۔ لیکن باقاعدہ طور پر عہدِ صدیقی میں مصحف کے نام سے ایک جامع نسخہ قرآن مرتب کیا گیا۔ جسے سورتوں کی طوالت و قصارت کے اعتبار سے سبع طوال، مئین، مثانی اور مفصل میں تقسیم کر دیا گیا، لیکن سور و آیات کی ترتیب وہی رہی جو خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بذریعہ وحی مقرر فرما دی تھی۔

چنانچہ عہدِ عثمانیؓ میں پھر تمام صحابہ و اہلِ بیت اور حفاظِ کرام کے مکمل اتفاق سے سرکاری طور پر ایک نسخہ تیار کیا گیا جو مصحفِ عثمانی کے نام سے معروف ہوا۔

قرآن کی جمع و تدوین کا یہ کام جو سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھوں پایۂ انجام تک پہنچا۔ دراصل خود اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت کی حفاظت میں ہوا۔ کیونکہ ارشادِ ربانی ہے۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (القیامۃ: ۱۷)

اس قرآن کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔

اس پہلو کا مطالعہ بیعتِ رضوان کے حوالے سے نہایت ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے قرآن کی جمع و تدوین کا آخری کام متعدد صحابہ و خلفاء کے باوجود حضرت عثمان غنیؓ سے کیوں لیا؟ اس کی وضاحت صلح حدیبیہ کے واقعہ سے ہوتی ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چودہ سو صحابہ کے ہمراہ بمقام حدیبیہ پڑاؤ کیا اور عثمان غنیؓ کو اہلِ مکہ کی طرف سفیر بنا کر بھیجا۔ اس اثناء میں اطلاع ملی کہ کفار و مشرکین مسلمانوں پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں اندریں صورت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام صحابہ کرام سے جہاد پر آمادگی کی بیعت لی۔ جسے "بیعتِ رضوان" کہا جاتا ہے اس کا ذکر قرآن میں یوں آتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ

آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے اللہ ہی کے ہاتھ پر

Marfat.com

يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ۔ (الفتح، ۴۸: ۱۰)

بیعت کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ اقدس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ اور آپ سے بیعت کو اپنی بیعت قرار دیا۔ جب تمام صحابہ کی بیعت ہو چکی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

ان عثمان فی حاجة اللّٰه تعالٰی و حاجة رسوله۔ فضرب باحدٰی یدیه علی الاخرٰی فکانت ید رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لعثمان رضی اللّٰه عنه خیراً من ایدیهم لانفسهم۔

(ترمذی، ۲: ۲۱۱)

(اے اللہ) عثمان تیرے اور تیرے رسول کے کام گیا ہوا ہے۔ پس آپ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر رکھا اور اپنے ہی ہاتھ کو عثمانؓ کا ہاتھ قرار دیتے ہوئے ان کی طرف سے بیعت لی۔ پس حضرت عثمانؓ کے لیے حضور کا ہاتھ دیگر تمام صحابہ کے لیے ان کے اپنے ہاتھوں سے بہتر تھا۔

ابنِ ہشام لکھتے ہیں:۔

بایع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لعثمان رضی اللّٰه عنه فضرب باحدٰی یدیه علی الاخرٰی۔ (تفسیر ابن کثیر، ۴: ۱۸۶-۱۸۷)

حضور علیہ السلام نے اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے بیعت لے لی۔

اب یہ پہلو قابلِ غور ہے کہ ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا جبکہ دوسری طرف "يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ" کے مطابق حضور علیہ السلام کے ہاتھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ قرار دیا۔ گویا بالواسطہ عثمانِ غنیؓ کے ہاتھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا دستِ حفاظت قرار دیا۔ لہٰذا اس ہاتھ سے جمع و تدوینِ قرآن کے کام کا انجام پانا وعدۂ الٰہی اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ "قرآن کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے" کے مطابق خود اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت سے ہی انجام پانا ہے۔

یہ اسی حفاظتِ الٰہیہ کا کرشمہ ہے کہ ۱۴۰۰ سال گزر جانے کے باوجود آج تک قرآن میں ایک آیت یا ایک لفظ اور حرف کی حد تک بھی کمی بیشی نہیں ہو سکی۔ آج بھی بعض علاقوں میں ہزار بارہ سو سال پرانے کلام مجید کے نسخے موجود و محفوظ ہیں۔ لیکن ان میں اور آج کے مطبوعہ نسخوں میں زیر و زبر تک کا فرق نظر نہیں آتا۔ قرآنی حقانیت کا اس سے بڑا اعجاز اور کیا ہو سکتا ہے۔

باری تعالیٰ نے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (بے شک ہم نے اس ذکر کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں) کے الفاظ کی صورت میں وعدۂ حفاظت قرآن کے سوا کسی اور الہامی کتاب یا صحیفے کے حق میں نہیں فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ بائبل (BIBLE) کی جمع و تدوین کی پوری تاریخ ردّ و بدل، حذف و اضافہ اور تحریف و ترمیم کی تاریخ ہے۔ دوسری صدی عیسوی سے لیکر سترھویں صدی عیسوی تک عہد نامۂ جدید (NEW TESTAMENT) میں کئی حصوں کو پادریوں کے

Marfat.com

حسبِ منشا اور مختلف کونسلو (COUNCILS) کے فیصلوں کے مطابق کبھی داخل کیا جاتا رہا اور کبھی نکالا جاتا رہا۔
برنباس اور کئی اور کتابیں جن کا مجموعہ ۱۶۷۲ء میں اپوسٹالک فادرز (APOSTOLIC FATHERS) کے نام سے شائع ہوا تھا، ایسی تھیں جنہیں عیسائیت کے اوائل دور میں نہایت مقبولیت حاصل رہی لیکن بعد میں انہیں بائبل میں سے محض اس لیے خارج کر دیا گیا کہ ان کی تعلیمات سینٹ پال کی خود ساختہ عیسائیت کے باطل عقائد کے خلاف تھیں۔ اسی طرح اپوکریفا (APO CRYPHA) اس عیسائی لٹریچر کا مجموعہ ہے جسے عیسائی پادریوں نے اپنے مذہبی مفادات کے خلاف تصور کرتے ہوئے چھپا دیا۔ لیکن اُنکا وجود دُنیا سے اب تک ختم نہیں ہو سکا۔
سب سے پہلی مکمل بائبل گوٹن برگ (GUTEN BURG) کے مطبع سے ۱۴۵۵ء میں ولگیٹ (VULGATE) کے نام سے چھپی جس کے خلاف ۱۶ویں صدی کے اوائل میں پھر پروٹیسٹنٹ اصلاحی تحریک کے ساتھ اعتراضات و تنقیدات کا دروازہ کھل گیا۔ الغرض ۱۵۴۶ء میں COUNCIL OF TRENT کے ذریعے اسے حتمی شکل دی گئی اور بالآخر رومن چرچ نے اسے بائبل کے مستند نسخے کے طور پر اپنا لیا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس میں پھر ردّو بدل کی ضرورت محسوس کی گئی اور POPE SIXTUS V نے ضروری ترمیمات و تصحیحات کے ذریعے یونیورسٹی آف پیرس کے متن کی صورت میں ۱۵۹۰ء میں شائع کیا۔ یہ مختصر تاریخی خاکہ تمثیلاً اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ اس کے تناظر میں قرآن کی حفاظت اور کاملیت و تمامیت کا جائزہ لیا جا سکے کہ دوسری الہامی کتابوں کے ارتقائی احوال کیا ہیں اور وہ کس طرح ہمیشہ ناقص و نا تمام رہی ہیں اور ان کے برعکس قرآن کا عالم کیا ہے کہ وہ ابتدائی دور سے لیکر آج تک اپنے متن اور عبارت کے لحاظ سے کامل و مکمل رہا ہے۔ اس میں آج تک نہ کسی لفظ یا آیت کی کمی کی گئی اور نہ کسی شے کا اضافہ۔ یہ جس حالت میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو عطا کیا تھا آج تک اسی حالت میں بغیر کسی تغیر و تبدل کے محفوظ ہے۔

۳۔ عدمِ اختلاف و تناقض

قرآن اپنے اعجاز پر ایک دلیل یہ بھی پیش کرتا ہے کہ وہ اختلاف و تناقض سے مبرا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۔ (النساء، ۴: ۸۲)

اگر قرآن اللہ کے سوا کسی غیر کی طرف سے ہوتا تو لوگ یقیناً اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔

عام مصنفین کی تالیفات سے قطع نظر دیگر مذاہب کی الہامی کتابوں پر بھی نظر ڈالیے تو آپ کو لاتعداد تضادات ملیں گے جن میں تطبیق بھی ممکن نہ ہوگی۔ مضامین کا اختلاف، ناموں اور نسبوں کا اختلاف، واقعات کا اختلاف، لشکر کی تعداد کا اختلاف، بیانات کا اختلاف، سنین و اوقات کا اختلاف۔ الغرض اجمال و تفصیل میں ہر جگہ مضحکہ خیز حد تک تضادات اور تناقضات ہیں جن کا جواب آج تک اس مذہب کے پیرو کار نہیں دے سکے اور نہ ہی ایسی کتابوں کو موضوع یا محرف ماننے کو تیار ہیں۔ مذکورہ بالا حقیقت کا مشاہدہ بائبل کے تنقیدی و تقابلی مطالعہ سے بآسانی ہو سکتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا امیریکانا (ENCYCLO PAEDIA AMERICANA) میں بائبل (BIBLE) کے مضمون کے تحت اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ اس کے مختلف نسخہ جات میں کم و بیش تیس ہزار۳۰ اغلاط

Marfat.com

موجود ہیں۔ اسی طرح FRED GLAD STONE BRATTON نے HISTORY OF BIBLE مطبوعہ بوسٹن .U.S.A صفحہ ۵ پر اس حقیقت کو بصراحت تسلیم کر لیا ہے کہ بائیبل کے اندر واقعاتی اغلاط، غیر سائنسی نظریات، خدا اور انسان کی نسبت ناپاک تصورات، تضادات و تناقضات، نامعقول بیانات مبالغہ آمیزیاں اور ناپختہ خیالات کثرت کے ساتھ موجود ہیں، لیکن اس کے برعکس قرآن اول سے آخر تک ہر قسم کے اختلاف اور تناقض سے پاک ہے بلکہ ہر آیت دوسری کی مؤید اور ہر مقام دوسرے کا مصدق ہے۔

۵ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب گر دلیلت باید ازوی رومتاب

قرآن حکیم میں ایک واقعہ بعض اوقات متعدد جگہ بیان ہوتا ہے۔ ہر مقام پر اندازِ بیان اور سیاق و سباق مختلف ہونے کے باوجود اس کی واقعیت میں کوئی خفیف سا اختلاف بھی نظر نہیں آسکتا۔ اس امر کی صحیح اہمیت کا اندازہ اس صورت حال کو سامنے رکھ کر ہو سکتا ہے کہ قرآن دیگر کتابوں کی طرح تصنیف نہیں ہوا بلکہ ۲۳ سال کے عرصہ میں کبھی دن کو کبھی رات کو کبھی سفر میں کبھی حضر میں کبھی گھر اور کبھی میدان جنگ میں الغرض ہمیشہ ہنگامی صورت میں اس کی چند آیات جن کی تعداد بالعموم تین سے دس تک ہوتی تھی نازل ہوتیں۔ آپ ذرا غور فرمائیے کہ اس طرح آیات کا تدریجی نزول ۲۳ سال تک جاری رہے۔ اس عرصہ میں حالات کے ہزاروں زیر و بم آئیں اور قرآن ایک جلد کی صورت میں مرتب بھی نہ ہو رہا ہو۔ بلکہ لوگ اپنے طور پر کاغذوں، کپڑوں، پتھروں اور ہڈیوں کے ٹکڑوں پر لکھ کر محفوظ کرتے ہوں۔ اس انداز سے اس کا نزول اور جمع و تدوین عمل میں آئے اور پھر بھی یہ ہر قسم کے اختلاف سے یکسر پاک رہے تو اس کے منزل من اللہ اور مبنی برحق ہونے پر کیا شبہ باقی رہ سکتا ہے۔ مستزاد یہ کہ اس وقت پریس بھی نہ تھے۔ صرف قلمی نسخوں کے ذریعے قرآن کی اشاعت ہو رہی تھی ـــــ نہ صرف عرب بلکہ فلسطین، مصر، شام، عراق، یمن اور ہندوستان تک کے عجمی ممالک میں قلمی نسخے تیار ہوئے اور ہر ایک کے سامنے صرف مصحفِ عثمانی کا معیار تھا اگر حفاظتِ الٰہیہ شاملِ حال نہ ہوتی تو عمداً یا سہواً عباراتِ قرآنی میں کئی اختلافات پیدا ہو سکتے تھے۔ جس طرح احادیث کے معاملے میں وضعِ حدیث کا فتنہ وجود میں آیا یہ فتنہ دامنِ قرآن کو بھی متاثر کر سکتا تھا لیکن یہ اعجازِ قرآن تھا کہ آج تک ایسا اختلاف صرف اعراب کی حد تک بھی پیدا نہ ہو سکا۔ حالانکہ اعراب لگانے کا کام بھی عہدِ رسالت کے بہت بعد میں ہوا۔ اس سے پہلے تمام نسخے بغیر اعراب کے پڑھے جاتے تھے ان دریں حالات قرآنِ حکیم کا ہر قسم کے اختلاف و تناقض سے مبّرا ہونا اس کے حق اور منزل من اللہ ہونے کی بیّن دلیل ہے

۴۔ ندرتِ اسلوب و نظمِ کلام

عہدِ نزولِ قرآن تک عربوں میں قصائد، مکتوبات، خطبات اور محاورات کے صرف چار اسالیب معروف تھے وہ کسی پانچویں اندازِ بیان سے واقف نہ تھے ان معینہ اور معلوم اسالیب سے مختلف ایک نیا اسلوبِ بیان پیدا کر لینا ایک معجزہ تھا۔

قرآن کی ندرتِ اسلوب کا یہ عالم ہے کہ یہ انداز آج تک کسی اور ادب میں پیدا نہیں ہو سکا۔ عام کتابیں ابواب فصول پر منقسم ہوتی ہیں لیکن قرآن ایسی تبویب و تفصیل سے پاک ہے اور نہ اس کے مختلف مضامین کو الگ الگ عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کے اسلوبِ بیان اور نظمِ کلام میں ایک تسلسل اور روانی ہے کسی جگہ پر انقطاع نظر نہیں آتا۔

قرآن نے اپنی بعض سورتوں کو حمد وثنا سے شروع کیا اور بعض کو غرض بیان کی وضاحت سے۔ بعض کا

Marfat.com

اختتام جامع کلمات پر کیا اور بعض کا نصیحتوں پر۔ کبھی وعدہ کا ذکر کیا کبھی تبشیر کا انداز اپنایا، کبھی تنذیر کا، کبھی تہدید کی کبھی تاکید، کبھی مخلوق کا بیان کیا کبھی خالق کا، کبھی کائنات کی نشانیاں بیان کیں کبھی قصص و واقعات، کبھی حلت و حرمت کے احکام دیئے کبھی استثنیٰ و رخصت کے، کبھی احقاق حق کیا کبھی ابطال باطل، کہیں مخاصمہ کا رنگ اپنایا، کہیں موعظت کا کہیں انبیاء و مرسلین کی تعلیمات و خدمات بیان کیں کہیں ان کی عظمتیں اور رفعتیں، کہیں خطاب ہے کہیں غیبت اور کہیں تکلم، انداز کلام بغیر تکلف کے بڑی بے ساختگی سے بدلتا رہتا ہے لیکن حلاوت اور دلکشی برقرار رہتی ہے۔ قرآن کے اسلوب بیان اور نظم کلام کے سلسلے میں مزید دو امور قابل توجہ ہیں۔

ا : انتشار مطالب ب : تکرار مضامین

قرآنی علوم اور معارف و مطالب عام طور پانچ انواع پر مشتمل ہیں ـــ علم الاحکام، علم المخاصمہ، علم التذکیر بآلاء اللہ، علم التذکیر بایام اللہ اور علم التذکیر بالموت

ا : قرآنی اسلوب میں انتشار مطالب کا معنی یہ ہے کہ قرآن اس امر کی رعایت نہیں کرتا کہ اس سورت میں صرف فلاں نوع کا علم مذکور ہوگا اور دوسری سورت میں فلاں نوع کا، بلکہ ایک ہی سورت میں متعدد انواع کے مطالب و معارف بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک علم کے ساتھ متصلاً دوسرا علم بیان کرنا کسی دوسری کتاب میں تو یقیناً مذاق لطیف پر گراں گزرتا ہے لیکن قرآنی اعجاز کا یہ عالم ہے کہ بدلتے ہوئے مضامین و مطالب کے باوجود بیان اور تفہیم میں روانی اور لطافت برقرار رہتی ہے یہاں تک کہ ایسا محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اب روئے سخن بدل گیا ہے بات بغیر بار کے دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ مثلاً سورۃ "الضحیٰ" کا مطالعہ کیجئے : ـ

وَالضُّحٰى ۝ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝	قسم ہے چاشت کی اور رات کی جب وہ پردہ ڈال دے کہ (اے محبوب) تجھے تیرے رب نے نہ چھوڑ دیا ہے اور نہ ہی وہ ناراض ہے بے شک تمہارے لیے ہر اگلی گھڑی پہلی سے بہتر ہے۔ اور بے شک تمہارا رب تمہیں اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے کیا اس نے تمہیں یتیم نہ پایا پھر جگہ دی اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی اور تمہیں حاجت مند پایا پھر غنی کر دیا۔ تو یتیم پر دباؤ نہ ڈال اور سائل کو نہ جھڑک اور اپنے رب کی نعمتوں کا خوب چرچا کر۔

یہاں چاشت اور رات کی قسم کھائی جارہی ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہ روٹھنے کا بیان ہے پھر آپ کو خوشخبریاں سنائی گئی ہیں، پھر آپ کی یتیمی اور محبت میں وارفتگی کا ذکر ہے۔ پھر حاجت مندی کے دور کا ذکر ہے اس کے بعد یتیموں اور سائلوں سے بھلائی کا حکم ہے اور پھر تحدیث نعمت کا حکم ہے۔ ایک چھوٹی سی سورت میں احکام، انعامات الٰہیہ اور سابقہ احوال و واقعات سب کچھ درج کر دیا گیا ہے اسی طرح سورۃ یوسف، سورۃ کہف، سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ ہود

Marfat.com

سورۂ یونس اور دیگر سورتوں کا مطالعہ کیجیے آپ کو مطالب کے تنوّع اور انتشار میں بھی ایک ہم آہنگی اور اتصال نظر آئے گا۔ یہ خوبی دنیا کی کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی کیونکہ اس میں مضامین کے تنوع کے باوجود آیات کے درمیان معنوی ربط برقرار رہتا ہے۔ سورۂ الکوثر پر نظر ڈالیے :

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۔ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ	اے محبوب ! بیشک ہم نے تمہیں خیر کثیر عطا کی پس اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی دے بیشک تمہارا دشمن ہی محروم و نامراد ہے۔

اس مختصر سی سورت کے تین جملے ہیں۔ تینوں جملوں میں الگ الگ اور اپنی اپنی جگہ مستقل معنی و مطلب بیان کیا گیا ہے۔ تینوں آیتوں میں احکام مختلف ہیں لیکن ایک دوسرے سے معنوی اعتبار سے پیوست معلوم ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے عطاءِ نعمت کا بیان ہے پھر حکمِ عبادت آخر میں مخالفوں کے لیے چیلنج ہے بلکہ پیشین گوئی بھی ہے گویا انتشارِ مطالب میں بھی معنوی اتحاد اور تسلسل کی کیفیت نظر آتی ہے۔

ب : تکرارِ مضامین میں حکمت و مصلحت یہ ہے کہ بعض اوقات کسی بیان کا مقصد صرف ایک حقیقت سے دوسرے کو آگاہ کرنا ہوتا ہے اور بعض اوقات اسے سامع کے دل میں جاگزیں کرنا ہوتا ہے پہلے مقصد کے لیے تو صرف ایک مرتبہ کا بیان کافی رہتا ہے لیکن دوسرے مقصد کیلیے بات کو بار بار مختلف انداز سے بیان کیا جاتا ہے ایسے مضامین کے لیے قرآن کے پیشِ نظر دوسرا مقصدِ تخاطب تھا۔ چنانچہ ایک ہی مضمون بار بار بیان ہوا۔ لیکن ہر دفعہ نئی حکمت و موعظت کے ساتھ جس طرح ذوقِ لطیف کا حامل شخص ایک اچھا شعر بار بار سنکر نئی لذّت اور لُطف اٹھاتا ہے اسی طرح قرآن میں تکرارِ مضامین ہر بار نئی لذت اور لطف کا باعث بنتا ہے، اگر کسی نثر کی کتاب میں ایسا ہو تو طبیعت پر بوجھ بنتا ہے اور عبارت اپنی رنگینی و دلکشی کھو بیٹھتی ہے لیکن قرآن منظوم نہیں نثر ہے اس کے باوجود اس کی بے پایاں لذّت قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔ مثلاً سورۂ شعراء میں اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۚ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۔ آٹھ بار آیا ہے سورۂ قمر میں وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ چار بار آیا ہے۔ سورۂ مرسلات میں وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ دس بار آیا ہے۔ سورۂ رحمٰن میں فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ" اکتیس بار آیا ہے، لیکن ہر جگہ ایک نیا لُطف اور منفرد کیفیت نصیب ہوتی ہے بلکہ اس تکرار سے دل و دماغ پر اکتاہٹ کے بجائے ہر بار نئے معانی و غوامض اور اسرار و رموز منکشف ہوتے ہیں۔ علامہ بدر بن جماعہؒ نے اسی موضوع پر "المقتنص فی فوائد تکرار القصص" کے عنوان سے ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے

۵۔ فصاحت و بلاغت قرآن کا اسلوب سادگی اور سلاست کے علاوہ فصاحت و بلاغت کے اس اعلےٰ مقام پر ہے جس کا معارضہ آج تک بڑے بڑے فصحاء و بلغا نہیں کر سکے۔ اس میں مقتضائے حال کی رعایت، استعارہ و کنایہ کا استعمال اور صنائع و بدائع کا وجود ناقابلِ بیان حسن اور ادبی چاشنی پیدا کرتا ہے۔ علامہ کرمانیؒ اپنی کتاب "العجائب" میں لکھتے ہیں کہ معاندین نے عرب و عجم کے تمام کلام ڈھونڈ مارے مگر کوئی کلام بھی حسنِ نظم جودتِ معانی، فصاحتِ الفاظ اور ایجاز میں اس کی مثل نہ پایا اور بالآخر اس امر پر متفق ہو گئے کہ انسانی طاقت قرآن کی آیت کی

Marfat.com

مثل لانے سے قاصر ہے قرآن کی فصاحتُ بلاغت کا یہ اعجاز تھا کہ دنیائے عرب کے ادبی شاہکار" سبع معلقات" جو خانہ کعبہ کے دروازے پر آویزاں تھے نزولِ قرآن کے بعد اتار لیے گئے کہ قرآنی فصاحت و بلاغت کے ساتھ کوئی شے بھی معارضہ نہیں کر سکتی۔

فصاحتِ قرآنی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

مجاز و کنایہ :

(۱) نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ (البقرہ، ۲ : ۲۲۳)
تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں تم اپنی کھیتی میں آؤ جیسے چاہو

(۲) هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (البقرہ، ۲ : ۱۸۷)
عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔

(۳) أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ (النساء، ۴ : ۴۳)
یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو

(۴) فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا (الاعراف، ۷ : ۱۸۹)
جب وہ (آدم) اس (حوا) کے پاس گئے تو اس نے ہلکا سا بوجھ اُٹھا لیا۔ (یعنی وہ اُمید سے ہو گئیں)

(۵) بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ (المائدہ، ۵ : ۶۴)
بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں وہ جیسے چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات میں جس لطافت کے ساتھ مجاز اور کنایہ کے انداز میں ہر بات کہی گئی ہے اس کا اندازہ صاحبِ ذوقِ لطیف ہی کر سکتا ہے۔

ان آیات میں بیان کی بے ساختگی اور اظہار کی بے تکلفی بھی ہے اور کمال درجہ حیا و شرافت کی آئینہ داری بھی۔ اشاروں میں نہایت حسن و خوبی کے ساتھ ایسے مضامین اور احکام و مسائل بیان کر دیئے گئے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا ادیب اشارت اور صراحت کے ایسے خوبصورت امتزاج کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

تشبیہ و استعارہ

(۱) مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ (النور، ۲۴ : ۳۵)
اس کے نور کی مثال قندیل کی ہے جس میں چراغ ہو

(۲) كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا (الجمعۃ، ۶۲ : ۵)
گدھے کی طرح جس نے کتابیں اٹھا رکھی ہوں

..یہاں علم سے صحیح فائدہ نہ اٹھانے والوں کا بیان کس قدر خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔

(۳) وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ (التکویر، ۸۱ : ۱۷-۱۸)
قسم ہے رات کی جب پیٹھ دے (یعنی تاریکی ہلکی پڑے) اور صبح کی جب دم لے (یعنی آہستہ آہستہ نمودار ہو)

Marfat.com

ان دو آیات میں رات کے دھیرے دھیرے جانے اور صبح کے رفتہ رفتہ آنے کا ذکر نہایت دلکش انداز میں ہے۔

چند مزید آیات ملاحظہ ہوں جن کی فصاحت بلاغت رشکِ ادب ہے۔

(۱) وَقِيلَ يَٰٓأَرۡضُ ٱبۡلَعِي مَآءَكِ وَيَٰسَمَآءُ	اور حکم دیا گیا اے زمین اپنا پانی نگل لے اور آسمان تھم جا
أَقۡلِعِي وَغِيضَ ٱلۡمَآءُ وَقُضِيَ ٱلۡأَمۡرُ	اور پانی خشک کر دیا گیا اور کام تمام ہوا اور کشتی کوہ جودی پر
وَٱسۡتَوَتۡ عَلَى ٱلۡجُودِيِّۖ وَقِيلَ	ٹھہری اور فرمایا گیا دور ہوں بے انصاف
بُعۡدٗا لِّلۡقَوۡمِ ٱلظَّٰلِمِينَ	لوگ۔

(ھود، ۱۱: ۴۴)

امام سیوطی الاتقان میں ابن ابی الاصبع کا قول نقل کرتے ہیں کہ میں نے آج تک اس آیت کی مثل نہیں دیکھی۔ اس میں سترہ لفظ ہیں اور بیس بدائع ہیں۔

ابلعی اور اقلعی میں مناسبت تامہ ہے، ابلعی اور اقلعی میں استعارہ بھی ہے، ارض و سماء میں صفت طباق ہے یسماء میں مجاز ہے، غیض الماء میں اشارہ ہے، واستوت میں صفت ارداف ہے قضی الامر میں تمثیل ہے قضی الامر میں تعلیل بھی ہے کیونکہ غیض الماء اس کی علت ہے، اس میں صحتِ تقسیم بھی ہے، اس میں احتراس فی الدعا ہے، اس میں حسن نسق ہے اس میں ائتلاف اللفظ مع المعنی ہے، اس میں ایجاز ہے، اس میں تسہیم ہے کیونکہ آیت کا اول اس کے آخر پر دلالت کرتا ہے، اس میں تہذیب ہے کیونکہ اس کے مفردات میں حسن ہے۔ ہر لفظ سہل المخرج ہے اور بشارتِ عقار سے خالی ہے، اس میں حسنِ بیان ہے، اس میں تمکین ہے، اس میں انسجام ہے، اور اس میں اعتراض بھی ہے کیونکہ یہاں تین جملے معترضہ لائے گئے ہیں۔

اسی طرح ایجاز کی مثال ملاحظہ ہو۔

(۲) وَلَكُمۡ فِي ٱلۡقِصَاصِ حَيَوٰةٞ (البقرہ ۲: ۱۷۹) تمہارے لیے انتقام و قصاص میں زندگی مضمر ہے۔

"الاتقان" میں مذکور ہے کہ اس آیت میں بھی (۲۰) صنعتیں بیان ہوئی ہیں۔

(۳) ٱللَّهُ وَلِيُّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ يُخۡرِجُهُم	اللہ ایمان والوں کا دوست ہے انہیں اندھیروں میں
مِّنَ ٱلظُّلُمَٰتِ إِلَى ٱلنُّورِ (البقرہ، ۲: ۲۵۷)	سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے۔

اس کی فصاحت و بلاغت کے بیان پر امام سیوطیؒ نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس میں ایک سو بیس بدائع بیان کیے ہیں۔ امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں کہ جو لوگ وجدانِ صحیح اور ذوقِ سلیم رکھتے ہیں ان کے لیے اعجازِ قرآن کی کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں فصاحت بلاغتِ قرآنی خود اپنی صداقت و حقانیت پر دلیلِ قاطع ہے۔ جن لوگوں نے سلامت ذوق اور استقامت طبع کے ساتھ عرب کے اساتذہ شعر و سخن کا کلام پڑھا اور اپنے ذوق و وجدان کو پختہ و شائستہ بنا لیا انہیں ہی فصاحت قرآن کی صحیح عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

احادیث، سیر و مغازی اور تاریخ اسلام کے طلبہ جانتے ہیں کہ عتبہ ابن ربیعہ، انیس غفاری، ولید بن ضماد، عمرو بن جمح

Marfat.com

حسان بن ثابت، کعب بن مالک، عبداللہ بن رواحہ، لبید، طفیل بن عمر، زید الخلیل، کعب بن زہیر، شماس، اسود بن سریع وغیرہم عرب کے معروف اور نامور سردار، سخن گو اور شعراء قرآن کی فصاحت و بلاغت کے سامنے سر خم تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔

ایک مرتبہ ایک اعرابی نے " فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ " کے الفاظ سنے اور سربسجود ہو گیا۔

اسی طرح قرآن کی یہ آیت فصاحت و بلاغت کا کیسا عظیم نمونہ ہے:۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ	اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی بھیجی کہ تم اس کو دودھ پلاؤ
فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ	اور جب تم کو اس کے متعلق خوف ہو تو اسے دریا میں
وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ اِنَّا رَآدُّوْهُ	ڈال دو اور نہ خوف کرو نہ غم پھر ہم موسیٰ کو تمہاری طرف
اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ	لوٹا دیں گے اور اس کو رسول بنائیں گے۔

سبحان اللہ کس قدر بلیغ کلام ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے بیک وقت دو امر کے صیغے اور دو نہی کے، دو خبریں اور دو بشارتیں بیان فرمائی ہیں۔ قرآن کی یہ معجزانہ فصاحت و بلاغت اس کے دعاوی اور اعلانات کی صحت و حقانیت کی ایسی دلیل ہے کہ کوئی بھی سلیم الطبع صاحب فن اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

۶۔ صوتی ترنم و تغنم قرآن حکیم کی ہر آیت اور اس کے مطلع و مقطع میں ایک خاص قسم کا صوتی حسن و جمال پایا جاتا ہے۔ یہ معنوی نغمگی اور باطنی موسیقیت شعری اوزان و قوافی سے مبرا ہونے کے باوجود فراوانی کے ساتھ محسوس ہوتی ہے۔ قرآن کی سحر بیانی کافی حد تک اس حسن صوتی پر منحصر ہے۔ اس اعتبار سے قرآنی سُوَر تین اقسام پر منقسم ہیں "طویل"۔ مثلاً سورۃ النساء "متوسط"۔ مثلاً سورہ اعراف اور انعام "قصیر"۔ مثلاً سورہ شعراء اور الدخان میں صوتی ترنم کی یہ کیفیت ہر شخص کے لیے عجیب لطف کا سامان پیدا کر دیتی ہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

مندرجہ ذیل آیات کو اسی خیال سے پڑھیے اور انہیں صوتی نغمگی کی کیفیت پر توجہ کیجیے۔

۱: نٓ ۚ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (ن)

۲: وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۙ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ۙ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۙ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۙ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۙ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۙ (المرسلت)

۳: فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۙ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۙ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۙ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ۙ لِاَىِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ۙ (المرسلت)

۴: وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۙ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۙ فِىْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۙ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ۙ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۘ (الغاشیہ)

۵: وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ۙ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۙ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۙ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۙ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۙ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ۙ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۙ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۙ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۙ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۙ (الشمس)

۶: اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۚ (الزلزال)

Marfat.com

۷: فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۝ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝ (العٰدیٰت)

مذکورہ بالا آیات میں سے ہر ایک کا اختتامی لفظ ایک خاص صوتی نغمگی پیدا کر رہا ہے۔ الفاظ کا چناؤ اور وزن۔ ان کا آپس میں جوڑ اور ترکیب، پھر ان میں تلفظ کی سلاست اور بہاؤ ایک عجیب موسیقیت اور موزونیت کی فضا پیدا کرتا ہے۔ ان آیات کو بار بار پڑھیں، سادگی سے پڑھیں یا مترنم انداز میں زبان میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی اور ہر لمحہ عجیب سی حلاوت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ مستزاد یہ کہ اگر مذاقِ سلیم اور حسِ لطیف ہو تو ان آیات کے تلفظ سے ہی کسی حد تک معنی و مفہوم کی ترجمانی ہوتی نظر آتی ہے۔

۱: مثلاً سورۃ الناس کو بار بار پڑھیں تو ہر آیت کا آخری حرف "س" کثرتِ استعمال کے باعث سرگوشی کی فضا پیدا کر دیتا ہے یہی سرگوشی اور وسوسہ اندازی اس سورت کا موضوع ہے۔

۲: اسی طرح سورۃ الملک میں ارشاد ہوتا ہے:۔

تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ — کچھ بعید نہیں کہ جہنم غُصّہ سے پھٹ جائے

یہاں لفظِ تَمَيَّزُ میں "ی" پر شد سے جو آواز پیدا ہو رہی ہے اسی سے غیظ و غضب کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔

۳: سورہ الفجر کی ان آیات کو پڑھیئے اور ان کے تلفظ پر غور کیجئے۔

اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا — جب زمین ٹکرا کر پاش پاش کر دی جائے گی

اس میں دُكَّتْ اور دَكًّا دَكًّا کے الفاظ کی تشدیدات سے جو صوتی کیفیت پیدا ہو رہی ہے اسی سے ہی ٹکرانے اور پاش پاش ہونے کا تاثر ابھرتا ہے۔

۴: اسی طرح سورۃ الرحمٰن میں ملاحظہ فرمائیں:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ — اس نے دو سمندر بہائے کہ دیکھنے میں ملے ہوئے معلوم ہوں

اس آیت کے تینوں الفاظ میں صوتی بہاؤ اور روانی کا سماں پایا جاتا ہے اور یہی اسکا موضوع ہے۔

۵: فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ — ان میں دو چشمے ہیں چھلکتے ہوئے۔

نَضَّاخَتٰنِ کا لفظ غور سے پڑھیئے اس میں "ض" پر شد سے کسی چیز کے پھٹنے اور چھلکنے کا تاثر ابھرتا ہے

۶: اسی طرح

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ — تکیہ لگائے بچھونوں پر

کے الفاظ میں سکون کی نشاندہی ہوتی ہے۔

چنانچہ قرآنی آیات اپنے اندر ایک قدرتی تناسب، توازن، موزونیت و موسیقیت اور ترنم و تغنّم رکھتی ہیں جس سے خاص قسم کی دلکشی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ صفت بھی قرآن ہی کا اعجاز ہے ایسا رنگ آج تک کسی اور کلام میں نہیں دیکھا جا سکا۔

۷۔ احوالِ غیب کا بیان

قرآن حکیم کی صداقت و حقانیت کا ایک بہت بڑا ثبوت اس میں احوالِ غیبی کا بیان ہے قرآن مجید نے اپنی اس حیثیت کو خود اپنے لفظوں میں اس طرح واضح کیا ہے۔

Marfat.com

ذَالِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ (آلِ عمران ۳ : ۴۴)

یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔

ایک اور مقام پر اس کی تصریح کرتے ہوئے فرمایا۔

تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا (ہود ۱۱ : ۴۹)

یہ غیب کی باتیں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔ اس سے پہلے ان کو نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم۔

قرآنی اعجاز کا یہ پہلو خود نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نمایاں معجزات میں سے تھا۔ آنحضرت ﷺ کبھی علومِ غیب کے بیان میں بخل نہیں کرتے تھے۔ سائل جس قسم کا بھی سوال لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا تسلی بخش جواب پاکر جاتا تھا۔ حضور علیہ السلام کے ہمہ جہت علم کے اس گوشے کا ذکر قرآنِ حکیم یوں کرتا ہے۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ (التکویر ۸۱ : ۲۴)

اور رسولِ اکرم ﷺ غیب بیان کرنے میں کوئی بخل نہیں کرتے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں :-

"یعنی یہ پیغمبر ہر قسم کے غیب کی خبر دیتا ہے، ماضی سے متعلق ہوں یا مستقبل سے، اللہ کے اسماء و صفات سے یا احکامِ شرعیہ سے، مذاہب کی حقیقت و بطلان سے یا جنت و دوزخ کے احوال سے یا واقعات بعد الموت سے اور ان چیزوں کے بتلانے میں آپ ذرا بخل نہیں کرتے۔"

بعد میں وہ پیغمبر علیہ السلام کے علمِ غیب کے بیان کے پیشِ نظر لکھتے ہیں :

"کاہنوں کو ان سے کیا نسبت ہو سکتی ہے کیونکہ وہ تو محض غیب کی جزئی اور نامکمل بات وہ بھی جھوٹ ملا کر بیان کرتے ہیں اور اتنی بات میں بھی بخیل ہوتے ہیں۔"

قرآنِ حکیم میں احوالِ غیب کا بیان کئی اعتبارات سے آیا ہے لیکن یہاں صرف دو کا ذکر کیا جاتا ہے :

(الف) اُممِ سابقہ کے احوال و واقعات

(ب) مستقبل کی پیشین گوئیاں

(الف) اُممِ سابقہ کے احوال و واقعات

قرآنِ حکیم نے اُممِ سابقہ اور گزشتہ انبیاء کے حوالے سے بہت سے واقعات و حالات بیان کیے ہیں جن میں سے کئی ایک کا ذکر پہلی کتابوں میں سرے سے موجود ہی نہ تھا اور بعض کا ذکر پہلی کتابوں میں تھا لیکن وہ اس قدر محرّف و متبدل صورت میں تھا جس کی صحت کے بارے میں کسی کے پاس کوئی یقینی شہادت موجود نہ تھی۔ قرآن نے ان احوال و واقعات اور انبیاء کی تعلیمات و خدمات کو سندِ تصدیق عطا کر دی۔

اس لیے اس کا لقب مُصَدِّقٌ لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ "اپنے سے پہلے کی تصدیق کرنے والا" قرار پایا۔ قرآن نے کئی مقامات پہ حضرت آدمؑ، حواؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، اسحاقؑ، اسماعیلؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، خضرؑ، سلیمانؑ، داؤدؑ، یونسؑ

Marfat.com

ذوالکفلؑ، صالحؑ، شعیبؑ، زکریاؑ یحییٰؑ، عیسیٰؑ و مریم اور اصحابِ کہف وغیرہم کے حالات کا بیان ہے۔

انکے علاوہ قومِ ہود، قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط اور دیگر اقوام و ملل کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح فرعون، نمرود، قارون اور ہامان وغیرہم کے احوال کا بیان ہے۔ ان کے علاوہ بھی قرآن حکیم میں اسی قبیل کے متعدد قصص بیان کیے گئے ہیں۔ کئی علماء نے "قصص الانبیاء" کے موضوع پر باقاعدہ تصانیف رقم کی ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن کے اعجاز اور اس کی صحتِ حقانیت کی دلیل یہ ہے کہ ایک ایسی ہستی کی زبان سے جس نے نہ کوئی تاریخ پڑھی ہو اور نہ کسی مؤرخ سے علمی استفادہ کیا ہو، ان احوال و واقعات کا بیان ہونا پھر اُس کا بعض روایات اور تاریخی نقطہ ہائے نظر کی تردید اور بعض کی تصدیق کرنا۔ بلاشبہ بہت بڑا معجزہ تھا۔ جب قرآن نے اپنے منکرین و مخالفین کے سامنے خود اپنے بیان کردہ قصص کو انباء الغیب (غیب کی خبریں) سے تعبیر کیا تو کسی بھی دشمن کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ ان قصص و واقعات کا کوئی زبانی یا کتابی ماخذ بنا کر قرآن کے اس دعوے کی تردید کر سکتا اور یہ کہہ سکتا کہ "اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم یہ دعویٰ کیسے کرتے ہو، حالانکہ تمہیں تو یہ معلومات فلاں ذریعے سے حاصل ہوئی ہیں"، لیکن تاریخ عالم شاہد ہے کہ آج تک یہ بات کوئی نہ کہہ سکا۔ پھر اس سے بھی زیادہ حیران کن بیانِ احوالِ غیب کا دوسرا پہلو تھا جو مستقبل میں رونما ہونے والے اہم واقعات سے متعلق تھا۔

(ب) مستقبل کی پیشین گوئیاں

پیشین گوئی کا طریقہ کسی دعویٰ کی صحت و حقانیت کے اثبات میں سب سے زیادہ نازک اور اہم ہوتا ہے۔ حقانیتِ قرآن کے داخلی دلائل میں سے یہ دلیل بھی بہت مؤثر اور فیصلہ کن ہے کہ قرآن نے بعض پیشین گوئیاں ایسے حالات میں کیں۔ جن میں ظاہراً ان کے وقوع پذیر ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ مخالفینِ قرآن وہ پیشین گوئیاں سُن کر حیران و ششدر رہ گئے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پیشین گوئیاں اپنے اپنے وقت پر حقائق و وقائع میں بدلتی چلی گئیں۔ یہ سب کچھ اب تاریخ کا ناقابلِ انکار حصہ بن چکا ہے۔ جو زبانِ حال سے قرآن کی صداقت و حقانیت کا اعلان کر رہا ہے۔ ذیل میں چند قرآنی پیشین گوئیاں بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ غلبۂ روم کی پیشین گوئی

یہ پیشین گوئی سب سے نمایاں اور حیرت انگیز ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۝ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ۭ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ (الروم، ۳۰: ۱ تا ۴)

الٓمّٓ۔ قریب کے ملک میں رومی مغلوب ہو گئے اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہوں گے۔ چند برسوں میں جن کی حد نو برس ہے۔ حکم اللہ ہی کا ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔

یہ آیت بعثتِ نبوی کے پانچویں سال نازل ہوئی۔ یعنی ۶۱۴ عیسوی میں۔ جبکہ ایرانیوں کے مقابلے میں رومیوں کی شکست کا آغاز ہو چکا تھا۔ جو بالآخر ۶۱۶ء میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اس جنگ میں بعض مؤرخین کے مطابق رومیوں کے نوّے ہزار آدمی قتل ہوئے۔ کلیساؤں کو نذرِ آتش کر دیا گیا اور سلطنتِ روم کو ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایرانی فتوحات کے عین شباب میں یہ پیشین گوئی کی کہ چند برس کے اندر رومی جھنڈے

Marfat.com

دوبارہ فتح کے ساتھ بلند ہوں گے۔ اس وقت اس سے زیادہ بعید از قیاس کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تھی کیونکہ ہرقل کی حکومت کے یہ سال سلطنتِ روم کی تباہی دکھانے کا اعلان کر رہے تھے۔ بہرحال ان نامساعد ناموافق حالات میں قرآن نے غلبۂ روم کی بظاہر بالکل مستبعد پیشین گوئی کا اعلان کیا اور رومیوں کی فتح یابی کے لیے بضع سنین کہہ کر نو برس تک کی حد مقرر کر دی۔ مستدرک، حاکم اور ترمذی کے باب "تفسیر سورۂ روم میں مذکور ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ "بضع کا لفظ تین سے نو تک پر بولا جاتا ہے" اس لحاظ سے اس پیشین گوئی کے ظہور کی آخری حد ۹ برس مقرر ہوئی۔ ترمذی میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ کی گلیوں اور بازاروں میں بلند آواز سے اس پیشین گوئی کا اعلان کرتے رہے۔

اس پیشین گوئی کے اعلان یعنی رومیوں کے آغازِ شکست سے ٹھیک آٹھ برس بعد ۶۲۲ء میں رومیوں کے تن مردہ میں پھر جان پیدا ہو گئی۔ وہ اُسی کاہل وعشرت پرست کمانڈر ہرقل کے زیرِ قیادت منظم ہو کر ایرانیوں پر حملہ آور ہوئے۔ ۶۲۳ء میں یعنی پیشین گوئی کے ٹھیک نویں برس رومی فتح و کامرانی سے ہم کنار ہوئے۔ بالآخر یہ فتح اس شان سے پایۂ تکمیل کو پہنچی کہ انہوں نے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک شہر واپس لے لیا اور ایرانیوں کو باسفورس اور نیل کے کناروں سے ہٹا کر پھر دجلہ وفرات کے ساحلوں تک دھکیل دیا۔ اس طرح قرآن کی پیشین گوئی کے سچ ثابت ہونے پر بے شمار کافر مسلمان ہو گئے۔

۲۔ فتح مکہ کی پیشین گوئی

۶ھ میں جب مسلمان صلح حدیبیہ سے واپس لوٹے تو ان میں عام بددلی اور مایوسی پائی جاتی تھی۔ وہ اس صلح اور اس کی شرائط کو اپنے لیے شکست کا اعتراف سمجھ رہے تھے یہاں تک کہ بعض نے صاف لفظوں میں اس خیال کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اطمینان قلب کے لیے قرآن مجید کی اس پیشین گوئی کا اعلان فرمایا۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا (الفتح ۴۸:۱) ہم نے تمہارے لیے عظیم الشان فتح مقدر کر دی ہے۔

اس آیت میں یہ اشارہ تھا کہ حدیبیہ کی صلح کو شکست نہ سمجھو، بلکہ یہ درحقیقت پیش خیمہ ہے ایک عظیم الشان فتح کا، جو فتح مکہ کی صورت میں تمہیں حاصل ہونے والی ہے۔ چنانچہ اسی صورت میں فرمایا گیا۔

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِن شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ (الفتح ۴۸:۲۷)

بے شک تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے۔ اگر اللہ چاہے امن و امان سے اپنے سروں کے بال منڈاتے یا ترشواتے ہوئے بے خوف ہو کر۔

بالآخر اس پیشین گوئی کا ظہور فتح مکہ کی صورت میں ۸ھ میں ہوا۔ صلح حدیبیہ سے مایوس ہونے والوں نے نتیجۂ اس صلح نامہ کی کامیابی و کامرانی کو دل و جان سے تسلیم کر لیا اور کفار مکہ جو اس معاہدے سے روگرداں ہو گئے جس کا خمیازہ انہیں کئی صورتوں میں بھگتنا پڑا۔

۳۔ فتح خیبر کی پیشین گوئی

غزوۂ خیبر کی فتح کے بارے میں بھی سورۃ الفتح میں پیشین گوئی کی گئی۔ ارشاد فرمایا گیا۔

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انطَلَقْتُمْ إِلَىٰ عنقریب کہیں گے پیچھے بیٹھ رہنے والے جب

Marfat.com

مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ — تم غنیمتیں لینے چلو تو ہمیں بھی اپنے پیچھے آنے دینا۔

(الفتح ۴۸: ۱۵)

جو لوگ حدیبیہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نہیں آئے تھے ان کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ صلح حدیبیہ سے واپس لوٹتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح خیبر کی پیشین گوئی بھی دی اور صراحت کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ غزوۂ خیبر میں تمہارے ہاتھ بہت سا مالِ غنیمت بھی آئے گا لیکن ہم نے وہ مالِ غنیمت صرف ان مجاہدین کے لیے مخصوص کر دیا ہے جو حدیبیہ کے موقع پر حضور علیہ السلام کے ہمراہ ہیں۔ اس وقت ساتھ نہ دینے والے اس مالِ غنیمت سے بھی محروم رہیں گے۔ چنانچہ اس پیشین گوئی کی صداقت بھی تاریخِ عالم کے صفحات پر نمایاں انداز میں مرقوم ہے، خیبر فتح بھی ہوا اور بے شمار مالِ غنیمت بھی مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

۴۔ غلبۂ اسلام کی پیشین گوئی

سب سے بڑھ کر حیرت انگیز وہ پیشین گوئی ہے جس میں مسلمانوں کو روئے زمین پر عظیم الشان تمکن و استخلاف اور اقتدار و استحکام کی خوش خبری سنائی گئی تھی حالانکہ اس وقت روم و ایران کی دو عظیم عالمی طاقتیں مشرق و مغرب پر اس طرح قابض و متصرف تھیں، جس طرح آج امریکہ اور روس۔ صحرائے عرب کے ان مکینوں کے بارے میں اس بے سر و سامانی کے عالم میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ بھی بین الاقوامی سطح پر ایک عظیم اور مؤثر طاقت بن کر ابھر سکتے ہیں۔ کیونکہ دونوں عالمی طاقتیں اس انقلابی قوم کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے پر تُلی ہوئی تھیں۔ انہیں حالات قرآن نے اس بشارت کا اعلان ان الفاظ میں کیا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا

(النور، ۲۴: ۵۵)

اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور اچھے کام کرنے والوں سے وعدہ کر لیا ہے کہ ضرور تمہیں زمین میں حکومت دے گا جس طرح پہلوں کو دی تھی اور ضرور ان کے لیے ان کا وہ دین (اسلام) جو اللہ نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے، مستحکم کر دے گا اور ضرور ان کے سابقہ خوف کو امن میں بدل دے گا۔

اس پیشین گوئی کا عملی ظہور بھی چشمِ فلک نے دیکھ لیا۔ عہدِ رسالت میں اسلامی فتوحات کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا۔ روز افزوں ترقی پذیر رہا۔ عہدِ خلافتِ راشدہ میں روم اور ایران سمیت تقریباً ۱۰ لاکھ مربع میل سے زائد رقبہ اسلامی سلطنت کے زیرِ نگیں تھا۔ عہدِ فاروقی میں بلوچستان کی سرحدوں تک مسلمان علمِ اسلام لے کر پہنچ چکے تھے۔

ابھی اسلام کی پہلی صدی ختم نہ ہوئی تھی کہ سپین سے آگے سرحدِ فرانس تک، مشرق میں سندھ اور ملتان تک، مزید برآں ماوراء النہر سے آگے سرحدِ چین تک، وسطی ایشیا، شمالی افریقہ اور دنیا میں انسانیت کے کثیر ترین حصے پر پرچمِ اسلام لہرانے لگا سطوتِ اسلام کا یہ پُرشکوہ نظارہ قرآنی وعدے کے مطابق تقریباً چھ سو سال تک قائم و دائم رہا۔ زوالِ بغداد کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پھر عثمانی ترکوں کی زیرِ قیادت ملتِ اسلامیہ کی سیاسی قوت مجتمع ہوئی اور بالآخر بین الاقوامی سطح پر غلبۂ اسلام کا دور پھر چھ سو سال تک منصۂ عالم پر شہود پذیر رہا۔

Marfat.com

اس طرح کی پیش گوئیاں جو قرآن نے بیان کیں اور اپنے اپنے وقت پر عالمِ خارج میں واقعہ بن کر حقانیتِ قرآن کی حتمی دلیلیں بنتی رہیں تعداد میں اتنی ہیں کہ ان کا احصاء و شمار آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔

۸۔ نتیجہ خیزی کی ضمانت

قرآنی اعجاز کی دلیلِ ناطق اس کی ہدایت کا نتیجہ خیز ہونا ہے۔ قرآن مجید نے نہ صرف اپنی ہر دعوت کو حتمی، قطعی اور یقینی طور پر فیصلہ کن اور نتیجہ خیز قرار دیا ہے بلکہ معیارِ صداقت و حقانیت بھی نتیجہ خیزی ہی کو قرار دیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں کامل یقین کے میسر آنے کی جس تدبیر کا بھی ذکر کیا گیا ہے وہ بہر صورت تجربی توثیق، مشاہدۂ حقیقت اور نتیجہ خیزی کے تصور پر مبنی ہے۔ موضوعِ متذکرہ کی وضاحت سے قبل ضروری ہے کہ نتیجہ خیزی کا مفہوم اور یقین کا تصور اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

مطالعۂ قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مشاہدۂ کائنات اس لیے کروایا گیا تھا کہ انہیں یقین کے اعلیٰ تمام پر فائز کیا جا سکے۔ ارشادِ باری ہے۔

وَكَذَٰلِكَ نُرِيٓ إِبْرَٰهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ ۝ (الانعام، ۶: ۷۵)

اور ہم نے اسی طرح ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہتوں کا مشاہدہ کروایا۔ تاکہ وہ صاحبِ یقین ہو سکے۔

حالانکہ کائناتِ ارض و سما کے وجود پر حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا ایمان تو پہلے بھی تھا اور یہ بھی یقیناً ان کے ایمان میں شامل تھا کہ آسمان و زمین کی ساری حکومت و سلطنت کا مالک باری تعالیٰ ہے لیکن ایمان کے بعد ایقان کو نتیجۂ مشاہدہ پر منحصر قرار دیا گیا۔ اسی طرح باری تعالیٰ کی قدرتِ اماتت و احیاء پر بھی ابراہیمؑ کا بحیثیت پیغمبر ایمانِ کامل تھا کہ وہ ذات جس طرح مارتی ہے اسی طرح زندہ کرنے پر بھی قادر ہے لیکن اس کے باوجود آپ نے عرض کیا۔

رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتَىٰ (البقرہ، ۲: ۲۶۰)

اے میرے رب! مجھے مشاہدہ کروا، تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔

اس مطالبہ پر ارشادِ باری ہوا۔

أَوَلَمْ تُؤْمِنْ (البقرہ، ۲: ۲۶۰) کیا تو اس بات پر ایمان نہیں رکھتا؟

حقیقت یہ ہے کہ ذاتِ حق بھی اس امر سے بے خبر نہ تھی کہ ابراہیمؑ میری قدرت پر ایمان تو رکھتے ہیں لیکن سوال کیوں کر رہے ہیں۔ قدرتِ باری پر ایمان کے بغیر 'پیغمبری' کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا اور ابراہیمؑ تو جدالانبیاء تھے۔ یہ سوال و جواب محض اس مقصد کے لیے تھا کہ خلقِ خدا ادھر متوجہ ہو اور قدرتِ الٰہیہ کے معروضی نتیجے کا مشاہدہ کر کے حضرتِ ابراہیمؑ کی طرح دولتِ یقین سے بہرہ ور ہو سکے۔ آپ نے عرض کیا۔

قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي (البقرہ، ۲: ۲۶۰)

انہوں نے جواب دیا (اے باری تعالیٰ) ایمان تو رکھتا ہوں لیکن مشاہدے سے اطمینانِ قلب چاہتا ہوں

چنانچہ آپؑ نے پرندوں کو ذبح کر کے ان کے ٹکڑوں کو مختلف پہاڑوں کی چوٹیوں پر متفرق طور پر رکھ دیا۔ اور انہیں ندا دی تو وہ زندہ ہو کر دوڑتے ہوئے چلے آئے۔ جب انہوں نے حکمِ الٰہی کی یہ نتیجہ خیزی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی

Marfat.com

تو فرمایا گیا۔

وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (البقرہ، ۲ : ۲۶۰)

پس اب جان لے کہ اللہ غالب حکمت والا ہے۔

اسی طرح حضرت عزیر علیہ السلام نے بھی مردوں کے زندہ ہونے کے امر کا معروضی نتیجہ دیکھنا چاہا۔ چنانچہ انہیں سو سال کے بعد پھر زندہ کیا گیا۔ ان کی سواری کو ان کے سامنے مٹی میں سے زندہ کیا گیا اور دوسری طرف انہیں یہ بھی دکھایا گیا کہ سو سال گزر جانے کے باوجود ان کا کھانا ابھی باسی نہ ہوا تھا۔ باری تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے یہ نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ کر حضرت عزیر علیہ السلام فرمانے لگے :

اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (البقرہ، ۲ : ۲۶۰)

میں جان گیا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

مشاہدہ نتائج سے حاصل ہونے والا یہ علم ایمان کے لیے نہ تھا۔ کیونکہ ایمان بالغیب تو پہلے ہی موجود تھا یہ علم حصولِ ایقان کے لیے تھا۔

مذکورہ بالا تین واقعات سے استشہاد و استدلال کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ قرآن کے نزدیک یقین نتیجہ خیزی کی اس ضمانت کا نام ہے جو معروضی نتائج کے مشاہدے کی صورت میں حاصل ہوتی ہے اسی لیے قرآن کہتا ہے۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (الحجر، ۱۵ : ۹۹)

اپنے رب کی عبادت کر یہاں تک کہ تجھے معروضی کامیابی اور نتیجہ خیزی کی ضمانت میسر آجائے۔

اسی مشاہدے کی منزل کا نام یقین ہے جس تک پہنچنے کے لیے حکمِ عبادت دیا جا رہا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ اگر کسی کے پیش کردہ نظریہ علم میں ایجابی اور منفی دونوں طرز کے نتائج پیدا کرنے کی ضمانت موجود ہو تو اس علم کو یقینی علم کہا جائے گا اور یہی خوبی قرآنی علم و ہدایت کا طرۂ امتیاز ہے۔

یقین اور نتیجہ خیزی کا مفہوم سمجھ لینے کے بعد قرآنِ مجید کا یہ اعجاز اور اس کی حقانیت کی یہ داخلی دلیل سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ قرآن میں نتیجہ خیزی کی ضمانت کا مفہوم یہی ہے کہ اس کے سلسلۂ علم و ہدایت کا یہ اعجاز ہے کہ اس کا ہر دعویٰ تجربی توثیق کی بنا پر معروضی نتائج پیدا کرنے کا ضامن ہے۔ اس سلسلے میں چند ارشاداتِ قرآنی ملاحظہ ہوں۔

• قرآنی ہدایت کے نزول کا مقصد یہ تھا کہ انسانیت کو دنیا و آخرت میں خوف و غم کی محیط کیفیت سے نجات دلا دی جائے۔ چنانچہ قرآن نے اپنے اس دعویٰ کی نتیجہ خیزی کا بیان اس طرح کیا۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (البقرہ، ۲ : ۳۸)

پس جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آجائے تو تم میں سے جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا پس اُس کو نہ کوئی خوف رہے گا اور نہ کوئی غم

• اسی طرح قرآن اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ (بیشک خدا کا گروہ ہی غالب ہونے والا ہے) کا اعلان کر کے اس دنیا میں باطل کے مقابلے میں غلبۂ دین کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ دعویٰ محض اس لیے نہیں کیا گیا کہ

Marfat.com

مسلمان اس کی آرزو تو کرسکیں لیکن اس کی عملی اور واقعاتی نتیجہ خیزی کا مشاہدہ نہ ہوسکے۔ چنانچہ اس امر کی ضمانت بھی ساتھ ہی مہیا کر دی گئی۔

- لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران، ۳: ۱۳۹)

تم پست ہمت نہ ہونا اور نہ غم کرنا، بیشک غلبہ و کامیابی تم ہی کو ملے گی۔ اگر تم (صحیح طور پر) صاحب ایمان رہے۔

- ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا۔

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ (محمد، ۴۷: ۳۵)

پس تم سستی نہ کرو اور نہ باطل سے سمجھوتہ کرو، پھر تم ہی غالب آکر رہو گے، اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہاری کوششوں کو بے نتیجہ (یا خسارے میں) نہیں جانے دے گا۔

- ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ (المائدة، ۵: ۵۶)

اور جو اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کو (صحیح معنوں میں) دوست بنائے بیشک (وہی) اللہ کا گروہ (ہے جو) غالب و کامیاب ہوگا۔

- اس امر کی مزید وضاحت درج ذیل آیت سے بھی ہوتی ہے۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (الصّٰفّٰت، ۳۷: ۱۷۱-۱۷۳)

اور بے شک ہمارا یہ وعدہ اپنے ان بندوں کے ساتھ جو انبیاء و رسل تھے پہلے ہی سے ہو چکا ہے یقیناً ہماری مدد و نصرت انہیں کو حاصل رہتی ہے اور یقیناً ہمارا ہی لشکر (یعنی گروہ) باطل کے مقابلے میں ہمیشہ غالب آتا ہے۔

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ خدا کا وعدہ محض دعوے سے نہیں بلکہ فی الواقع اس کارگہ حیات میں حق و باطل کے درمیان ہونے والی کش مکش میں اہل حق کو غالب اور فتحیاب کر دینے سے ہی پورا ہو سکتا ہے اور یہی دعویٰ قرآن کی نتیجہ خیزی ہے۔

- قرآن مجید انبیاء سابق کے حوالے سے اقوام حق و باطل کی منظم کش مکش کے ضمن میں ارشاد فرماتا ہے۔

وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۢ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجَادَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝ وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا

اور ہر گمراہ قوم نے اپنے رسول کے بارے میں ارادہ کیا کہ اسے پکڑلیں یعنی شکست دے دیں اور وہ باطل قوت کے ذریعے اس سے جھگڑتے بھی رہے تاکہ اس کش مکش سے حق کی تاثیر اور نتیجہ خیزی کو زائل کر دیں یعنی نتائج کے اعتبار سے پیغمبرانہ جدوجہد کو ناکام بنادیں۔ لیکن

Marfat.com

اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ

(المؤمن، ۴۰: ۵، ۶)

ہوا یہ کہ میں نے انہیں اپنی گرفت میں لے کر شکست دے دی۔ پس میری سزا کیسی تھی؟ اور (جس طرح اس دنیا میں میرا یہ وعدہ کہ حق کو فتح اور باطل کو ذلت آمیز شکست ہوگی، نتائج کے لحاظ سے سچا ثابت ہوا۔) اسی طرح تیرے رب کی یہ بات بھی کفار پر حق ثابت ہوگئی کہ وہی آگ میں جلیں گے۔

اگر اس آیت کے مضمون پر غور فرمائیں تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ قرآن نے اس دنیا میں اہل حق کی نتیجہ خیز کامیابی کو آخرت کی کامیابی کی دلیل قرار دیا ہے۔ جو قرآن آخرت میں اہلِ حق کی کامیابی اور اہلِ باطل کی ذلت و رسوائی کے تصور کی حقانیت و صداقت کے لیے اس دنیا میں وعدۂ غلبۂ حق کی تکمیل کو بطور ثبوت پیش کر رہا ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس قرآن نے اپنے ہر دعوے کی صداقت اور اس دنیا میں اس کی نتیجہ خیزی کی ضمانت مہیا نہ کی ہوگی۔ عقل سلیم اس امر کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے جو ذہن اس تصور پر قانع اور مُصر ہے کہ "جدوجہد کرنا ہمارا فرض ہے مطلوبہ نتائج پیدا ہوں یا نہ ہوں اس دنیا میں اس کی کوئی ضمانت نہیں۔ یہاں کی کامیابی کوئی معنی نہیں رکھتی، اصل کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے۔"

وہ دینِ حق کی صحیح معرفت سے محروم ہے اور وہ لاشعوری طور پر قرآنی ہدایت کی عظمت اور صداقت و حقانیت کا انکار کر رہا ہے۔ یہی پہلو تو درحقیقت قرآنی اعجاز کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اس کا کیا ہوا ہر وعدہ اسی دنیا میں نتیجہ خیزی کے ذریعے اپنی صحت و صداقت کا ثبوت فراہم کرتا ہے اور یہاں معروضی نتائج کا مشاہدہ کروا کر تنبیہ کرتا ہے کہ اسی طرح آخرت میں بھی کامیابی اہلِ حق کو اور ناکامی اہلِ باطل کو نصیب ہوگی۔ قرآن کا ہر دعویٰ ایک فیصلہ کن اور نتیجہ خیز حقیقت ہے۔ شاعرانہ تعلّی نہیں۔ اسی لیے ارشاد فرمایا گیا۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِيْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ

(یٰسین، ۳۶: ۶۹)

اور ہم نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شعر نہیں سکھائے اور نہ وہ اُن کے شایانِ شان تھے۔ بلکہ یہ تو کھلی نصیحت ہے اور روشن قرآن ہے۔

اس آیت کے ذریعے یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ قرآن کے دعاوی اور اعلانات شاعرانہ تعلّی نہیں ہیں جن کا عملی زندگی اور نتیجہ خیزی کے ساتھ کوئی واسطہ نہ ہو بلکہ یہ تو ایسی کھلی اور روشن حقیقتیں ہیں، جو خود ہی اپنی صداقت و حقانیت پر دلالت کرتی ہیں۔

قرآن مجید نے اپنی تاثیرات و خصوصیات کا ذکر مختلف عنوانات کے ذریعے کیا ہے، اگر ان کی معنوی دلالت پہ غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قرآن ہر عنوان کے تحت اپنی کسی نہ کسی فیصلہ کن اور نتیجہ خیز حیثیت کو بیان کر رہا ہے۔ مثلاً

• —— قرآن - ہدایت ہے —— اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا۔ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (اسراء، ۹:) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن تاریکی و ظلمت اور بے یقینی کی کیفیت سے نکال کر منزل مقصود تک پہنچا دینے کی حتمی و قطعی ضمانت عطا کرتا ہے۔

Marfat.com

• ـــــ قرآن ـــــ تصدیق ہے ـــــ اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا۔
وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ (یوسف : ۱۱۱) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن صحف ماقبل کی آسمانی حیثیت اور ان کے احکام و تعلیمات کی حقانیت کی فیصلہ کن ضمانت عطا کرتا ہے۔

• ـــــ قرآن ـــــ تفصیل و تبیین ہے ـــــ اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا۔
وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ (یوسف : ۱۱۱) الخ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ
اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن حقائق کائنات کے تمام گوشوں کی تفصیلی وضاحت اور علمی و فکری تشکیک کے خاتمے کی یقینی ضمانت عطا کرتا ہے۔

• ـــــ قرآن ـــــ رحمت ہے ـــــ اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:
وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (یوسف : ۱۱۱) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن اپنے ماننے والوں کو انفرادی اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہر قسم کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی اذیت سے نجات کی اطمینان بخش ضمانت عطا کرتا ہے۔

• ـــــ قرآن ـــــ شفا ہے ـــــ اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:
وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ (یونس : ۵۷) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن ہر فرد اور معاشرے کو داخلی و خارجی اور ظاہری و باطنی ہر قسم کے امراض و مصائب سے کلی نجات کی ضمانت عطا کرتا ہے۔

• ـــــ قرآن ـــــ موعظت ہے ـــــ اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:
قَدْ جَاءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (یونس : ۵۷) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن تنبیہ، تنذیر اور تبشیر کی صورت میں نفسیاتی تبلیغ کے ذریعے شعور انسانی کو طلب کمال اور اس کے حصول کی حتمی ضمانت عطا کرتا ہے۔

• ـــــ قرآن ـــــ بشارت ہے ـــــ اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:
وَهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (نحل : ۸۹) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن دنیا و آخرت میں خیر اور حق کو شر اور باطل کے مقابلے میں فتح و نصرت اور کامیابی و کامرانی کی بشارت انگیز ضمانت عطا کرتا ہے۔

• ـــــ قرآن ـــــ فرقان ہے ـــــ اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:
وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (بقرہ : ۱۸۰) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان واضح نتیجہ خیز اور فیصلہ کن امتیاز کے ظہور کی ضمانت عطا کرتا ہے۔

• ـــــ قرآن ـــــ مخرج من الخوف والحزن ہے ـــــ اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا۔
فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (بقرہ : ۳۸) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن فرد اور معاشرے کو اپنی پیروی کی صورت میں ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی خوف و غم سے بے نیاز کر دینے کی ضمانت عطا کرتا ہے۔

• ـــــ قرآن ـــــ روشن کتاب ہے ـــــ اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:
تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ (النمل : ۱) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن واضح اور

Marfat.com

فیصلہ کن انداز میں غلبۂ حق کی جد وجہد کے تمام مراحل کے لیے جملہ تفصیلات اور قطعی نتیجہ خیزی کی ضمانت عطا کرتا ہے۔

مذکورہ بالا قرآنی حیثیات جہاں اپنی تاثیر اور افادیت کے لحاظ سے عام ہیں وہاں ان کا فیضان بھی عام ہے اور فیصلہ و نتیجہ بھی۔ خواہ اس ابدی اور آفاقی اصول اور ضابطے کو مسلمان اپنالیں یا غیر مسلم۔ چونکہ قرآن کا فیضان کائناتی ہے اور اس کا دائرہ خطاب بھی آفاقی ہے۔ لہٰذا بلا امتیاز رنگ و نسل اور علاقہ و مذہب جو قوم و ملّت اور طبقۂ افرادِ انسانی قرآنی تعلیم اور ہدایت کے جس گوشے کو عملاً اپنالے گا، قرآن کا فیصلہ اپنی تاثیر کے اعتبار سے اسی کے حق میں ناطق اور نتیجہ خیز ہوگا۔ قرآنی تعلیمات اپنی نفع بخشی اور فیض رسانی کے باب میں کسی کے لیے بھی جانب دار نہیں ہیں۔

اس نکتے کی وضاحت سے یہ اشکال رفع ہو جائے گا کہ آج مسلمان قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود علمِ کفر کے مقابلے میں شکست خوردہ، کمزور، ناتواں اور پریشان حال کیوں ہیں۔؟

قرآنی تعلیمات کی فیصلہ کن تاثیر اور نتیجہ خیزی ان پر محض ایمان لانے سے نہیں بلکہ ان کو انسانی زندگی میں واقعہ بنانے سے میسر آتی ہے۔ ایمان کا دعویٰ کرنے والے اگر ان تعلیمات کو عملاً خیرباد کہہ چکے ہوں اور کفر و طاغوت کے علمبردار اپنی زندگی کے بعض گوشوں میں ان تعلیماتی حقائق کو عملاً واقعہ بنا چکے ہوں تو کیا وجہ ہے کہ وہ اس کائناتی کتاب کی نتیجہ خیز ہدایت کے فیضان سے محروم رہیں۔ قرآنی ہدایت کی نتیجہ خیزی کا وعدہ بالعموم اس کی تعلیمات کے حوالے سے ہے نہ کہ افراد و طبقات کے حوالے سے، اس لیے جو کوئی بھی کسی مخصوص قرآنی تعلیم کی نتیجہ خیزی کی شرائط کو پورا کیے بغیر نتیجہ خیزی کی آرزو کرے گا یہ آرزو محض عبث ہوگی اور جہاں تک اُخروی فلاح کا تعلق ہے تو وہ ہے ہی صرف مومنین و صالحین کے لیے۔ اس لیے اس میں سے ہر ایک برابر حصہ نہیں لے سکتا۔ قرآنی ہدایت و تعلیمات اور اس کے اصول و ضوابط کے درمیان مذکورہ بالا امتیاز کو سمجھ کر ہر سوال کا تسلی بخش جواب میسر آسکتا ہے۔ اگر قرآن کے بیان کردہ تمام ضابطوں کی افادیت، تاثیر اور نتیجہ خیزی صرف ایک کلمہ گو طبقے تک محدود کر دی جائے تو اس کی آفاقی و کائناتی حیثیت برقرار نہیں رہتی۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ قرآن پوری نوعِ انسانی کی رہنمائی اور فلاح و بہبود کے لیے نازل ہوا ہے اور رسالتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت بھی اسی طرح عالم گیر ہے۔ قرآن خود اعلان کرتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ (الاعراف، ۷: ۱۵۸)

اے نسلِ بنی آدم! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔

چنانچہ جو کوئی جتنا قرآنی ہدایت کو عملاً قبول کرے گا وہ اسی قدر حصہ پائے گا۔ اسی "قرآنی نتیجہ خیزی کی ضمانت" کا نام مشیتِ الٰہی ہے۔ ربِّ ذوالجلال نے آفاقی اصول و ضوابط بنی نوعِ انسان کو عطا کر دیے ہیں اور انہیں ان کے ردّ و قبول میں آزاد چھوڑ دیا ہے جو کوئی ان پر عمل کرے گا یا ان سے انحراف کرے گا۔ مقررہ ایجابی اور منفی نتائج بھگت کر رہے گا۔ مسلم ہو یا غیر مسلم مشیتِ الٰہی کے اس نتیجہ خیز فیصلے سے کسی کو مفر نہیں ہو سکتا۔ قرآنی ہدایت کی یہ خوبی اس کی حقانیت اور اعجاز کی ایسی ابدی دلیل ہے جس کا مشاہدہ آج بھی زوال پذیر ملّتِ اسلامیہ کر رہی ہے۔

غیر اسلامی قوتوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی پستی نے جب انہیں ذہنی اور فکری طور پر بھی مضمحل کر دیا تو ان کی سوچ ہر لحاظ سے نا اُمیدی کا شکار ہوگئی اس مایوسی کی بنا پر شعوری یا لاشعوری عمل کے باعث

Marfat.com

تین تصورات نے جنم لیا۔

○ ایک یہ کہ خاتمۃ اسلام کے قابلِ عمل ہونے کی نسبت اعتماد باقی نہ رہا۔ بنا بریں اندازِ فکر یہ ہوگیا کہ اسلام چودہ سو سال پہلے کی تہذیب ہے اس کے تہذیبی و سماجی فضائل اور سیاسی و معاشی ضوابط آخر آج کے بدلے ہوئے حالات میں کیوں کر قابلِ عمل ہو سکتے ہیں۔

○ دوسرے یہ کہ مستقبل میں مسلمانوں کے احیاء اور دوبارہ عروج حاصل کر سکنے کی کوئی امید اور تدبیر باقی نہ رہی۔ اربابِ علم و دانش کا ذہن اس بات پر مطمئن ہوگیا کہ ہزار بارہ سو سال سے زائد عرصہ تک پوری دنیا پر حکمرانی کر لینے کے بعد زوال ایک فطری امر تھا اسلام کے غلبہ و عروج کی یہی عمر طبعی تھی جو اس نے پوری کر لی اس سے زائد مدت کے لیے اس کے غلبے کا باقی رہنا ممکن نہ تھا لہٰذا اب اس میں وہ قوت۔ فعالیت اور تاثیر باقی نہیں رہی جو مستقبل میں مسلمانوں کے از سرِ نو احیاء کی ضمانت دے سکے۔

○ تیسرے یہ کہ قرآن و سنت کی ہدایت کی نسبت نتیجہ خیزی کا یقین ختم ہوگیا۔ مذہبی ذہن نے اسلامی تعلیمات کے بارے میں یہ خیال وضع کر لیا کہ اس پر عمل پیرا ہونا محض اُخروی فلاح کا ضامن ہے اس کا نتیجہ آخرت کے اجر و ثواب کی صورت میں متحقق ہوگا اور یہی اصل کامیابی ہے دنیا میں معروضی نتائج کا حصول ضروری نہیں۔ اس کارگہِ حیات میں ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم قرآن و سنت کی ہدایات کے مطابق عمل اور جدوجہد کرتے چلے جائیں۔ نتائج پیدا ہوں یا نہ ہوں کامیابی ظاہراً حق کو ہو یا باطل کو۔ اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ کیوں کہ نتیجہ خیزی کی ضمانت ہمیں نہیں دی گئی اور نہ ہی نتیجہ خیزی معیارِ صداقت و حقانیت ہے۔ صرف آخرت کی کامیابی ہی اصل کامیابی ہے۔

موضوع زیرِ بحث اِس تیسرے تصور سے متعلق ہے کہ ایک خاص مذہبی ذہن نے قرآن و سنت کی ہدایت سے نتیجہ خیزی اور معروضی و واقعاتی کامیابی کی ضمانت کا تصوّر اس لیے خارج کر دیا ہے کہ اس کی اپنی جدوجہد مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کر سکی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی سطح پر غیر اسلامی قوتوں کا اثر و نفوذ اس کی کوششوں سے کم نہیں ہو سکا۔ باطل طاغوتی طاقتوں اور فتنوں کے مقابلے میں اسلام کے نام پر کی جانے والی کاوشیں مطلوبہ تبدیلی پیدا نہیں کر سکیں۔ اندریں صورت دو ہی ردِّ عمل ممکن تھے۔

○ ایک یہ کہ اپنے پروگرام اور طریقِ کار کو ناقص اور اصلاح طلب تصوّر کر کے اس پر نظرِ ثانی کی جائے۔

○ دوسرے یہ کہ اسلام اور قرآن و سنت کی ہدایت میں سے کامیابی اور نتیجہ خیزی کا تصور حذف کر لیا جائے اور دنیا کو یہ بتایا جائے کہ ظاہری نتائج کے اعتبار سے کامیابی یا ناکامی کوئی فیصلہ کن امر نہیں ہے اس سے پروگرام کی صحت و عدمِ صحت یا صداقت و عدمِ صداقت متعین نہیں ہو سکتے۔ اسلام نے ہمیں صرف جدوجہد کے لیے مامور اور مکلف کیا ہے۔ نتائج کا معاملہ ہمارے سوچنے کا نہیں۔

اس ذہن نے باطل کے مقابلے میں اپنی شکست کی خفّت و ندامت کو چھپانے کے لیے دوسرا موقف اختیار کر لیا۔ اور اس کو اسلامی تصوّر کا نام دے دیا۔ مستزاد یہ کہ باوجود ناکامی کے اپنی فکری و عملی قیادت کو بحال رکھنے کی خاطر اس نے ایک قدم یہ بھی کیا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام پر تبلیغی جدّوجہد اور پیغمبرانہ مساعی کے باوجود نتائج کے لحاظ سے ناکامی کا الزام لگا دیا۔ اور اس امر کا پرچار کیا گیا کہ ہزاروں انبیاء کرام دنیا میں تشریف لائے۔ انھوں نے مسلسل جدّوجہد کی پے در پے کوششیں کیں

Marfat.com

لیکن معروضی نتائج کے لحاظ سے کامیابی حاصل نہ کر سکے اور وہ معاذاللہ ناکام ہو کر واپس اپنے مالک سے جا ملے۔

یہ نقطۂ نظر محض اپنی مدافعت کے لیے وضع کیا گیا ہے تاکہ یہ کہا جا سکے کہ جب خدا کے برگزیدہ انبیاء نتیجۃً ناکام ہوتے رہے ہیں تو ہماری ناکامی سے کیا فرق پڑتا ہے اس پرستزاد یہ کہ اس تصور کو قرآن کی طرف منسوب کر دیا گیا۔

پیغمبرانہ جدّوجہد کو نتائج کے لحاظ سے ناکام سمجھنے والے ذہن نے بزعم خویش انکی ناکامی کے اسباب بھی تلاش کر لیے کبھی انکی محض انفرادی کوششوں کو (معاذاللہ) ان کی ناکامی کا سبب قرار دیا گیا یعنی وہ اس لیے مقصد حاصل نہ کر سکے اور اپنے اپنے ادوار میں اسلامی نظام نافذ نہ کر سکے کہ ان کی جدّوجہد اجتماعی طور پر بھرپور انداز سے نہ ہوئی تھی۔ کبھی تنظیم کے فقدان اور کبھی تربیت یافتہ جتھے اور گروپ کے فقدان کو ان کی ناکامی کی وجہ تصوّر کیا گیا۔

علیٰ ہذا القیاس انسانی ذہن اپنی قیادت کے تحفظ اور ندامت سے بچاؤ کی خاطر خدا جانے کیا کیا کچھ کہہ گیا۔ گویا ہزاروں انبیاء اس طرح یکے بعد دیگرے ناکام ہوتے رہے لیکن اس گروہِ انبیاء میں سے کوئی نبی بھی ناکامی کے اسباب کو سمجھ کر ان کا تدارک اور انسداد نہ کر سکا اور نہ ہی (معاذاللہ) خالقِ کائنات جو ان انبیاء کو مبعوث کر رہا تھا خود اس امر کو متعین کر سکا کہ میرے انبیاء و رُسل کفار و مشرکینِ عالم اور منکرینِ حق کے مقابلے میں نتائج کے لحاظ سے مسلسل ناکام واپس لوٹ رہے ہیں۔ اس طرح میری ہدایت کا مذاق ہو رہا ہے آخر اس کا سبب کیا ہے؟ اور اس کا سدِباب کس طرح ہو سکتا ہے تاکہ جس مقصد کے لیے انبیاء کو بھیجا جا رہا ہے وہ اس میں کامیاب لوٹ سکیں۔

اگر یکے بعد دیگرے سینکڑوں انبیاء کو (معاذاللہ) ایسی بے نتیجہ جدّوجہد کے لیے دنیا میں بھیجنا تھا کہ باطل کو شکست ہی نہ دی جا سکے تو آخر اس کارروائی کا مقصد کیا تھا؟ کیا (معاذاللہ) صرف انبیاء و رسل اور آسمانی ہدایت کی تضحیک مقصود تھی؟ یقیناً نہیں۔ ایسا سوچنا بھی کفر ہے اگر ایسا نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر ہمیں انبیاء کی جدّوجہد کی نسبت نتائج کے لحاظ سے ناکامی کے مفروضے کو غلط اور بے بنیاد قرار دینا ہوگا اور اس امر کا اعتراف کرنا ہوگا کہ کوئی بھی نبی نتائج کے لحاظ سے کبھی ناکام واپس نہیں لوٹا بلکہ پیغمبرانہ جدّوجہد کے بے نتیجہ ہونے کا تصوّر ہی خلافِ اسلام ہے اور قرآن کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی ایسا خیال ہرگز اپنے ذہن میں نہیں لا سکتا۔

یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ قرآنِ حکیم میں بعض انبیاءِ سابقین جن میں نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، شعیبؑ، لوطؑ اور اسی طرح چند دیگر انبیاء بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں کے بیان کیے گئے حالات کو صحیح طور پر سمجھا نہیں گیا۔ "ہم اسلام کے سیاسی غلبے اور نفاذ کو بلاامتیاز ہر نبی کے مقصدِ بعثت کے طور پر بنائے قیاس از خود متعین کر لیتے ہیں کہ ہر نبی کم از کم اسی کام کو انجام تک پہنچانے کے لیے مبعوث ہوا ہوگا یہ تصور ہمارا خود تراشیدہ ہے اور پھر اس خود ساختہ تصوّر کی بنیاد پر ہم ان کی جدّوجہد کا مطلوبہ نتیجہ دو ٹوک انداز میں دیکھنا چاہتے ہیں جو حسبِ خواہش دکھائی نہیں دیتا تو ہم اس پر ظاہری ناکامی کا الزام دھر دیتے ہیں۔ یہ اندازِ جستجو ہی غلط ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہر نبی کا مقصدِ بعثت، اس کی جدّوجہد کا رخ اور غرض و غایت از خود متعین کرنے کے بجائے خود انہی انبیاء کی زبانی قرآن سے متعین کریں کہ وہ اپنے مقصدِ بعثت کے بارے میں خود کیا بتاتے ہیں اور پھر ان کے اپنے بیان کردہ مطمعِ نظر اور مقصدِ جدّوجہد کی روشنی میں قرآن سے نتائج کے مبنیہ طور پر پیدا ہونے یا نہ ہونے کا سوال کریں اس طرح کسی کی کامیابی یا ناکامی کو صحیح طور پر جانچا جا سکتا ہے۔ جب بھی کوئی نبی کسی قوم یا طبقے کی طرف

Marfat.com

بھیجا گیا اس نے سب سے پہلے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا کہ میں تمہارے پاس اس کام کے لیے آیا ہوں اور مجھے یہ معاملہ سرانجام دینا ہے میری بات مان لو جو کوئی میری بات مانے گا اسے فائدہ پہنچے گا اور جو شخص انکار کرے گا نقصان اٹھائے گا یہ کہہ کر اس نے اپنی جدوجہد شروع کر دی۔ انجام کار اس کی کامیابی یا ناکامی کو اس کی جدوجہد کے آغاز میں کیے گئے اعلان اور چیلنج کی روشنی میں پرکھا جائے گا کہ جو دعویٰ اس نے شروع میں کیا تھا۔ کیا واقعی ایسا ہوا یا نہیں ؟ کیا اس کا چیلنج پورا ہو سکا یا نہیں؟ اس کی بات نتیجے کے لحاظ سے سچی ثابت ہوئی یا نہیں۔؟

اگر روزِ اوّل کا کیا ہوا چیلنج پورا ہو گیا تو جدّوجہد نتیجہ خیز، فیصلہ کن اور کامیاب قرار پائے گی اور اگر چیلنج پورا نہ ہو سکا تو بے نتیجہ اور ناکام تصور ہو گی آئیے اب اسی کسوٹی کے ذریعے قرآن حکیم میں سے "پیغمبرانہ جدّوجہد اور اس کے نتائج" کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہاں قرآن مجید کا یہ دعویٰ بھی پیش نظر رہنا چاہیئے۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىْ (المجادلہ، ۵۹: ۲۱)

اللہ تعالےٰ نے یہ طے کر لیا ہے کہ ہمیشہ میں اور میرے رسول ہی اپنی جدّوجہد میں کامیاب اور غالب رہیں گے۔

اس دو ٹوک فیصلۂ الٰہی کے بعد اس امر کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ کسی دور میں بھی کسی پیغمبر کی جدّوجہد باطل کے مقابلے میں بے نتیجہ رہی ہو اور اُسے اسی دنیا میں اپنی جدّوجہد کے نتیجے میں واضح اور مبیّنہ کامیابی حاصل نہ ہوئی ہو۔ انبیاء کے حق میں وعدۂ الٰہی کا پورا ہونا یہی ہے کہ وہ حق کے لیے جدّوجہد کریں۔ باطل قوتیں ان کی راہ میں مزاحم ہوں۔ باطل کی کوششیں پیغمبرانہ جدّوجہد کو ناکام بنا دینے کی خاطر ہوں لیکن اس مقصد میں وہ خود ناکام ہو جائے اور پیغمبرانہ جدّوجہد اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کر کے رہے گویا حق و باطل کے اس تصادم میں پیغمبرانہ جدّوجہد کا اپنے نتائج کے اعتبار سے کامیاب و کامران ہونا ہی احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی واحد صورت ہے۔ اس لحاظ سے پیغمبرانہ جدّوجہد کی فیصلہ کن تاثیر اور نتیجہ خیزی معیارِ صداقت قرار پا گئی۔ اگر پیغمبرانہ جدّوجہد کے قرآنی فلسفہ پر غور کیا جائے تو بلا شک و شبہ یہ حقیقت منظرِ عام پر آ جاتی ہے کہ حق کی کامیابی یہی ہے کیا حق اور باطل کی دو قوتیں باھم برسرِ پیکار ہوں ـــ۔ دونوں کے پیچھے ایک ایک منظم ارادہ کارفرما ہو۔ ایک اتمامِ نورِ حق کا اور دوسرا اطفاءِ نورِ حق کا (یعنی نورِ حق کو مکمل کرنے کا اور نورِ حق کو بجھا دینے کا)۔ اتمامِ نورِ حق کے ارادے سے مراد یہ ہوا کہ پیغمبرانہ جدّوجہد یا حق کی قوت معروضی نتائج کے اعتبار سے کامیاب ہو اور دنیا اس کا کھلا ہوا مشاہدہ کر لے اور اطفاءِ نورِ حق کے ارادے سے مُراد یہ ہوا کہ حق یا پیغمبرانہ جدّوجہد اپنے چیلنج کو پورا نہ کر سکے اور نتائج پیدا کرنے میں ناکام رہے۔ لیکن انجام کار پیغمبرانہ جدّوجہد اپنے نتائج کو پہنچ جائے اس کا چیلنج پورا ہو چکے اور اس طرح اس کا حق ہونا تجربی توثیق کی بنیاد پر ہر ایک کے سامنے آشکار ہو جائے اور باطل قوتیں دنیا میں ہی اپنے اس انجام کو پہنچ جائیں جس کا وعدہ انبیاء کے چیلنج میں کیا گیا تھا۔ پیغمبرانہ جدّوجہد اور اس کے نتائج کے اس اصول کو قرآن یوں واضح کرتا ہے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (التوبہ، ۹: ۳۲)

اہلِ باطل یہ چاہتے ہیں کہ نورِ حق کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ کو ایسا ہرگز گوارا نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ کہ وہ عالم کفر کی مخالفت و مزاحمت کے باوجود اپنے نور کو

Marfat.com

پورا کر دے یعنی اسے مطلوبہ منزل اور نتیجے تک پہنچا دے

اسی اصول کی مزید وضاحت قرآن سے ملاحظہ فرمائیے ارشاد ہوتا ہے۔

وَ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ٥ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (الانفال ۸ - ۷:۸)

اور اللہ کا ارادہ ہے کہ اپنے وعدوں کے ساتھ حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کو جڑ سے کاٹ دے تاکہ حق کا سچ ہونا اور باطل کا جھوٹ ہونا آشکار ہو جائے گو مجرم اس کو ناپسند کرتے رہیں۔

اس آیت میں بھی حق کا غالب آنا اور باطل کا نتیجۃً شکست کھا جانا۔ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی دلیل قرار دیا گیا ہے گویا یہ امر طے ہو گیا کہ پیغمبرانہ جدوجہد کا اپنے نتائج کے لحاظ سے کامیاب ہونا احقاقِ حق کے لیے ضروری ہے ورنہ دنیا میں کلماتِ الٰہیہ کی صحت کا کوئی فیصلہ کن طبعی ثبوت فراہم نہ ہو سکے گا۔ قرآن نے انبیاء سابقین کے حوالے سے اس امر کی وضاحت یوں کی ہے۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ٥ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَ بِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ٥ ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ

(فاطر ، ۳۵: ۲۴-۲۶)

اور کوئی قوم ایسی نہ تھی جس میں ڈرسنانے والا نہ آیا ہو۔ اور اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ اس سے پہلے لوگ بھی جھٹلاتے رہے ہیں ان کے پاس بھی اس کے رسول کھلے دلائل، صحائف اور روشن کرنے والی کتاب یعنی واضح اور نتیجہ خیز پروگرام لے کر آئے تھے جن کی انہوں نے مخالفت کی۔ لیکن میں نے انہیں پکڑ لیا۔ یعنی انہیں ناکام بنا دیا۔ پس میرا عذاب اور گرفت ان کا انکار کرنے والوں کے لیے کیسی تھی۔

مندرجہ بالا قرآنی آیات کا ایک ایک لفظ کتنے واشگاف انداز میں اس حقیقت کی ترجمانی کر رہا ہے کہ پیغمبرانہ جدوجہد کبھی کسی دور میں بھی بے نتیجہ نہ رہی۔ اس کے نتائج کا پیدا کرنا خود غیرتِ الٰہیہ کا تقاضا تھا اس لیے وہ نتیجہ خیز ہوتی رہی اور ہر باطل قوت جو اس سے ٹکرائی نہ صرف خود ناکام و نامراد ہوئی بلکہ اس کا نام و نشان بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا اسی سورت میں انبیاء سابق کی دعوت کی نتیجہ خیزی بیان کرتے ہوئے قرآن نے اعلان کیا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۔ (فاطر ۳۵: ۵)

اے بنی نوع انسان! خدا کا وعدہ حق ہے (اسے دُنیا کی کوئی طاقت غلط ثابت نہیں کر سکتی)

اب اسی فلسفے کی روشنی میں سورۂ ہود کا مطالعہ فرمائیے۔ انبیاء سابقین کی جدوجہد اور اس کے نتائج کے بارے میں جتنے شبہات پیدا ہو سکتے تھے آیت نمبر ۲۵ سے آیت نمبر ۱۲۳ تک تمام کا تسلی بخش جواب آ گیا ہے۔

حضرت نوحؑ ہوں یا حضرت ہودؑ۔ حضرت صالحؑ ہوں یا حضرت شعیبؑ حضرت لوطؑ ہوں یا حضرت موسیٰؑ

Marfat.com

ہر پیغمبر نے مبعوث ہوتے ہی اپنی قوم کے سامنے اپنی بعثت کا متعین مقصد بیان کر دیا اور کہا کہ میرے ذمے صرف دو چیزیں لگائی گئی ہیں۔

○ ایک یہ کہ پیغامِ حق تم تک پہنچا دوں۔
○ دوسرے یہ کہ اس کی حقانیت، صداقت اور نتیجہ خیزی کا مشاہدہ تمہیں اسی زندگی میں کرا دوں۔

دعوت کے دوسرے پہلو کے لیے ہر پیغمبر نے اپنی قوم کو چیلنج کیا۔ جو کوئی میری اطاعت کرے گا، میرے پروگرام کی تائید کرے گا اور میری جدوجہد میں شریک ہو جائے گا وہ نجات یافتہ ہوگا اور جو میری مخالفت کرے گا اور حق کے راستے میں مزاحم ہوگا اسی دنیا میں اور میری زندگی میں ہی تباہ و برباد اور نیست و نابود ہو جائے گا۔"

ہر پیغمبرانہ جدوجہد اور دعوت کا آغاز اس چیلنج سے ہوا تھا اور پورے قرآن سے ایک شہادت بھی ایسی میسر نہیں آسکتی کہ کسی پیغمبر کی جدوجہد کے نتیجے میں یہ چیلنج پورا نہ ہوا ہو۔ جس جس نے پیغمبرانہ دعوت کو قبول کر لیا بامراد ہوا اور جس جس نے اس کی مخالفت کی اور مزاحمت سے باز نہ آیا تاریخ عالم اور چشم فلک شاہد ہے کہ وہ اسی پیغمبر کی زندگی میں ہی تباہ و برباد ہو گیا انکار کرنے والی قومیں مٹ گئیں۔ کچھ طوفانوں کی نذر ہو گئیں۔ کچھ بلندی سے گر کر تہ و بالا ہو گئیں کچھ پتھروں کے عذاب سے ختم کر دی گئیں کچھ کی شکلیں مسخ ہو گئیں۔ کچھ خوفناک آواز اور چنگھاڑ سے تباہ ہو گئیں، کچھ سمندروں میں غرق ہو گئیں اور کچھ قتل و غارت کی نذر ہو گئیں۔

الغرض پیغمبرانہ جدوجہد کے دونوں قسم کے نتائج ہر دور میں برآمد ہوئے اطاعت گزار محفوظ ہو گئے اور منکرین نیست و نابود۔ یہ نتائج بعد میں آنے والی اقوام و ملل کے لیے سامان عبرت تھے یہ ساری تاریخ پیغمبرانہ جدوجہد اور انبیاء و مرسلین کی کامیابی و کامرانی کی تاریخ تھی اسے ان کی ناکامی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی سلسلے میں قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَجَآءَكَ فِىْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (ھود ۱۱: ۱۲۰)	اور یہ سارے کے سارے واقعات جو ہم احوالِ رسل میں سے آپ کو سناتے ہیں یہ صرف اس لیے سناتے ہیں کہ ان سے آپ کے دل کو تقویت پہنچے اور اس قرآن میں آپ کے پاس حق (کا نکھرا ہوا تصور) آ گیا اور مومنین کے لیے عبرت و نصیحت۔

بات بڑی واضح ہے اگر انبیاء کی تاریخ (معاذ اللہ) ان کی ناکامیوں کی تاریخ ہوتی تو اس کے بیان سے حضور ﷺ کے قلبِ مبارک کو تقویت نہیں بلکہ تکلیف اور مایوسی ہوتی حالانکہ قرآن اس کے ذکر کو باعثِ تقویت و فرحت قرار دے رہا ہے۔

اس لیے پیغمبرانہ جدوجہد کی ساری تاریخ کامیابی و کامرانی کی تاریخ ہے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے عبرت و نصیحت بھی کہ انہیں یہ علم ہو جائے کہ دعوتِ انبیاء کو ٹھکرانے والے اس طرح نیست و نابود ہو گئے اور ان کے اطاعت گزار اس اس طرح سرخرو ہوئے۔

Marfat.com

قرآن نتیجہ خیز تاریخی لائحہ عمل کا نام ہے

ہماری قرآن اپنے دعووں اور اُن کی نتیجہ خیزیوں کی ایسی تابناک اور یقین انگیز تاریخ بیان کرتا ہے کہ اس سے احوالِ زندگی سنوارنے کا حتمی و قطعی لائحہ عمل میسر آجاتا ہے آج مطالعۂ تاریخ میں اس لیے کوئی جان، ولولہ اور اثر انگیزی باقی نہیں رہی کہ یہ صرف اقوام وملل کی ترقی وانحطاط کی داستان سے مختص ہو کر رہ گیا ہے قرآن کے نزدیک تاریخ مختلف اقوام کے حالات کے ایسے عبرت انگیز جائزے اور مشاہدے کا نام ہے جس سے اپنی ملت کا مستقبل سنوارنے کی نہ صرف امنگ پیدا ہو بلکہ واضح لائحہ عمل بھی متعین ہو سکے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ۔

(الحج، ۲۲: ۴۶)

کیا انہوں نے زمین کے احوال کا جائزہ نہیں لیا کہ ان کے دل ہوں جن سے سمجھیں یا کان ہوں جن سے سنیں تو یہ کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں۔ گویا دیکھتی ہیں لیکن وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں یعنی دیکھنے کے باوجود انہیں عبرت حاصل نہیں ہوتی اور وہ ماضی سے اپنے مستقبل کے لیے کوئی ہدایت اخذ نہیں کر سکتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج ہم تاریخِ اسلام کا مطالعہ قرآن کے مطابق دلِ بینا سے نہیں کر رہے بلکہ اپنے ماضی کا جائزہ ایسی بے بصیرتی سے لے رہے ہیں جس میں مستقبل کے لیے اُمید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ ایسا مطالعہ جو یاس و ناامیدی کا باعث ہو مُردہ ہے۔ کیوں کہ قرآن کے نزدیک مطالعۂ تاریخ کا فلسفہ حصولِ عبرت وہدایت ہے اور اگر وہ مطالعہ جاندار ہو تو اسی میں مستقبل کے لیے حیات بخشی کی ضمانت بھی مضمر ہے ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ

(النمل، ۲۷: ۶۹)

زمین کی سیر کرو اور دیکھو کہ مجرم اقوام کا انجام کیا ہوتا رہا ہے۔

قرآن خود بھی ایک حیثیت سے انبیاء سابق کی تاریخ ہے۔ قرآن نے اپنے اندر سابقہ انبیاء و اُمم کے حوالے سے تاریخی واقعات کے بیان کیے جانے کا فلسفہ ان لفظوں میں واضح کیا ہے۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ

(ہود، ۱۱: ۱۲۰)

اور یہ جو کچھ ہم آپ پر رسولوں کی خبریں یعنی تاریخ انبیاء بیان کرتے ہیں اس سے ہم آپ کا دل مضبوط کرتے ہیں اور اسی میں ہی آپ کو حقیقت سے آگاہی ہوئی اور اہلِ ایمان کو موعظت و نصیحت یعنی بیداری نصیب ہوئی۔

آیت مذکورہ سے تین اصول مستنبط ہوتے ہیں۔

Marfat.com

پہلا یہ کہ اسلام کی تاریخ اہلِ ایمان کے لیے باعثِ ایقان و تسکینِ قلب ہونی چاہیئے کہ وہ ان کے لیے سرچشمۂ حیات ثابت ہو۔

دوسرا یہ کہ اسلام کی تاریخ سے اہلِ نظر کو حق پر مشتمل ایک ایسا واضح کائناتی اصول اور ضابطہ میسر آنا چاہیئے جس کے ذریعے عروج و زوال کی ایک ہمہ گیر توجیہہ ہو سکے۔

تیسرا یہ کہ اسلام کی تاریخ سے اہلِ بصیرت کو مستقبل کے لیے ایسی موعظت و نصیحت اور واضح ہدایت نصیب ہونی چاہیئے۔ جس سے وہ اپنے احیاء و تجدید کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔

اگر بنظرِ غائر جائزہ لیں تو یہ حقیقت آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ یہ تینوں چیزیں تبھی ممکن ہیں اگر تاریخِ اسلام کے ہر واقعے سے بالآخر ایک ہی نتیجہ اور ایک ہی اصول اخذ ہو رہا ہو۔ وحدتِ نتائج کے بغیر علمِ تاریخ محض بے ضابطہ اتفاقات و حادثات کا مجموعہ قرار پائے گا۔ جس کی کوئی عملی افادیت باقی نہ رہے گی اور وہ نتیجہ یہ ہے کہ حق کی پیروی سے بالآخر فتح اور حق کی خلاف ورزی سے بالآخر شکست متحقق ہوتی ہے اسی کو فنِ تاریخ کی اصطلاح میں کائناتی قانونِ عروج و زوال کہتے ہیں۔ جس کا اعلان قرآن ان الفاظ میں کرتا ہے۔

بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (الاحقاف، ۴۶: ۳۵)

پیغامِ حق کا پہنچنا یہ ہے کہ کیا حق کی خلاف ورزی کرنیوالی قوم کے سوا کسی اور کو بھی تباہ کیا گیا۔ ہرگز نہیں

گویا تباہی و ہلاکت صرف حق سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ قرآنی تعلیمات میں نتیجہ خیزی کی قطعی ضمانت کا یہ اسلوب خود اسکی حقانیت کی ایسی زبردست دلیل ہے کہ دُنیا کی کوئی کتاب آج تک اس کا بدل یا مثل پیش نہیں کر سکی۔

۹۔ اُمیّتِ صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمیّت ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے کہ دعوتِ اسلام پر برہم ہو کر کفار و مشرکینِ مکہ نے آپ کو کیا کچھ نہیں کہا وہ کون سا افترا و بہتان تھا جو اُن لوگوں نے پیغمبرِ اسلام کے خلاف نہیں باندھا۔ آپ کو (معاذ اللہ) ساحر، کاہن اور مجنوں کہا، ایذا رسانی میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا لیکن سب کچھ کہنے اور کرنے کے باوجود پورے عالمِ کفر میں سے کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہو سکی کہ آپ اُمّی نہیں ہیں اور یہ قرآن آپ کا اپنا تحریر کردہ ہے۔ گویا آپ پر اتہامِ کذب کوئی نہیں لگا سکا۔ آج تک مخالفینِ اسلام میں سے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکا کہ حضور علیہ السلام نے اعلانِ نبوت سے قبل یا بعد کسی مکتب میں تعلیم حاصل کی ہو۔ کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے ہوں۔ کسی فاضل سے علوم و معارف، عربی ادب کی فصاحت و بلاغت، شعر و سخن کے اصول اور حکمت و دانائی کے خزانے حاصل کیے ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے معاشرے میں اُمّی اور صادق و امین کی حیثیت سے معروف تھے۔ قرآن جیسے علم و معرفت سے معمور کلام کا آپ کی زبانِ مبارک سے ادا ہونا ہی اسکے منزل من اللہ ہونے پر دلالت کرتا ہے اسی لیے ارشادِ ربانی ہے:۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (العنکبوت ۲۹: ۴۸)

اور تم نے قرآن سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھی تھی اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو یہ باطل پرست یقیناً شک میں مبتلا ہو جاتے۔

Marfat.com

پھر اسی سورۃ میں آگے چل کر فرمایا گیا ہے :-

اَوَلَمْ یَکْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْهِمْ (العنکبوت ۵۱:۲۹)

کیا ان لوگوں کے لیے یہی دلیل کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے

گویا آپ پر ایسی کتاب کا نازل ہونا اور آپ کا اسے تلاوت کرنا ہی اس وحی کی صداقت و حقانیت کی روشن دلیل ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی مکتب، مدرسہ یا استاذ سے پڑھے بغیر زمانہ گذشتہ و آئندہ کے احوال بیان کرے عقائدِ صحیحہ کا مدلل احقاق اور عقائدِ باطلہ کا قوی ابطال کرے، انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی زندگی کے اصول و ضوابط بیان کرے، اعلیٰ اخلاق اور مذہبی تعلیمات کا پرچار کرے، طبیعی اور مابعد الطبیعی حقائق کا تفصیلی ذکر کرے۔ سیاست و معاشرت اقتصاد و معیشت اور تہذیب و ثقافت کے اصولوں کی تعلیم دے اور ان پر کامیابی سے عمل پیرا بھی ہو۔ صلح و جنگ اور قومی و بین الاقوامی امور سے متعلق قوانین بتلائے۔ حکمت و دانائی، تدبر و بصیرت اور ضابطۂ اصلاحِ احوال پر مبنی اس اعلیٰ فلسفۂ حیات کی بات کرے جو ابدالآباد تک قابلِ عمل اور انقلاب آفریں ہو لیکن پھر بھی اس کا کلام حق تصور نہ کیا جائے۔ یہ کتنی بڑی ناانصافی ہے۔ بلاشک و شبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اُمیّت قرآن کی حقانیت کی بہت بڑی دلیل تھی۔ حضور علیہ السلام نے اُمی ہونے کے باوجود ماکان و مایکون کے جمیع علوم خود رب ذوالجلال سے حاصل کر لیے تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا۔ (النساء ۴:۱۱۳)

اور اللہ نے آپ کو علم عطا فرمایا ہر اس چیز کا جو آپ نہ جانتے تھے اور اللہ کا آپ پر بہت بڑا فضل ہے

لفظِ قرآن کے چوتھے مادۂ اشتقاق کے حوالے سے مذکورہ بالا نو قرآنی داخلی دلائل میں سے چند ایک ہیں جن سے قرآن کی صداقت و حقانیت بغیر کسی خارجی شہادت کے پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے باری تعالیٰ نے اس مقدس و معظم کتاب کا نام "القرآن" رکھا تاکہ دلائل و شہادات کے طالبوں پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ یہ وہ کتاب ہے جو اپنے ہر دعوے کی صحت و صداقت کے ثبوت میں خود اپنے اندر ہی ہزاروں داخلی قرائن رکھتی ہے۔ اسے اپنی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے اصلاً کسی خارجی دلیل کی حاجت نہیں

Marfat.com

Marfat.com

اسلام کے علمی، عملی، روحانی اور انقلابی پہلوؤں پر مشتمل

جناب پروفیسر محمد طاہر القادری کی چند معرکۃ الآراء

تصانیف

(۱) تسمیۃ القرآن تفسیر بسم اللہ الرحمن الرحیم
(۲) سورۂ فاتحہ اور تعمیر شخصیت
(۳) اسلامی فلسفۂ زندگی
(۴) اجزائے ایمان حصہ اول
(۵) اجزائے ایمان حصہ دوم
(۶) اجزائے ایمان مکمل مجلد
(۷) ایمان اور اسلام
(۸) فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟
(۹) مناہج العرفان فی لفظ القرآن
(۱۰) بلاسود بنکاری (عبوری خاکہ)
(۱۱) منافقت اور اس کی علامات
(۱۲) سیاسی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
(۱۳) معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
(۱۴) اجتہاد اور اس کا دائرہ کار
(۱۵) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور فلسفۂ خودی
(۱۶) تاریخ فقہ میں ہدایہ و صاحب ہدایہ کا مقام
(۱۷) معارف اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم
(۱۸) شہادت توحید
(۱۹) اقبال اور تصور عشق
(۲۰) تحقیق مسائل کا شرعی اسلوب
(۲۱) حکمت استعاذہ (تفسیر اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم)
(۲۲) فلسفۂ تسمیہ (بسم اللہ الرحمن الرحیم)
(۲۳) معارف اسم اللہ جل جلالہ
(۲۴) صفت رحمت کا شانِ امتیاز

(۲۵) عصر حاضر اور فلسفۂ اجتہاد
(۲۶) حصولِ مقصد کی جدوجہد اور نتیجہ خیزی
(۲۷) پیغمبرانہ جدوجہد اور اس کے نتائج
(۲۸) قرآنی فلسفہ تبلیغ
(۲۹) فطرت کا قرآنی تصور
(۳۰) قرآنی فلسفۂ عروج و زوال
(۳۱) پیغمبر انقلاب اور صحیفۂ انقلاب
(۳۲) عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم (وقت کی اہم ضرورت)
(۳۳) Islam In Various Perspectives
(۳۴) Quranic Concept of Human Guidance
(۳۵) Islam and Freedom of Human will
(۳۶) Islamic Concept of Human Nature
(۳۷) Quranic Basis of Constitutional Theory
(۳۸) Philosophy of Ijtihad and the Modern World
(۳۹) Islamic Concept of Crime
(۴۰) Islam-The State Religion
(۴۱) Islamic Philosophy of Punishments
(۴۲) Islamic Concept of Law
(۴۳) Divine Pleasure (The Ultimate Ideal)
(۴۴) Islamic Philosophy of Human Life
(۴۵) Constitutional Structure of an Islamic State (U.P.)

اتفاق اسلامک اکیڈمی ایچ بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور فون ۸۵۴۹۲۲ ❀ ضیاء القرآن پبلی کیشنز گنج بخش روڈ لاہور ۶۳۴۶۴
❖ جامعہ مسجد رحمانیہ ۲۰۵ شادمان لاہور (برموقعہ درس) ❖ ای پلومر۔ شاہراہ قائد اعظم بالمقابل ہائیکورٹ لاہور فون ۵۲۰۹۶
❖ المالک فلیٹس B/6 نزد جہانگیر پارک بالمقابل امپرس مارکیٹ کراچی صدر فون: ۴۳۸۴۸۲

Marfat.com

اسلام کے علمی، عملی، روحانی اور انقلابی پہلوؤں پر مشتمل

جناب پروفیسر محمد طاہر القادری کی چند معرکۃ الآراء

تصانیف

(۱) تسمیۃ القرآن تفسیر بسم اللہ الرحمن الرحیم
(۲) سورۂ فاتحہ اور تعمیر شخصیت
(۳) اسلامی فلسفۂ زندگی
(۴) اجزائے ایمان حصہ اول
(۵) اجزائے ایمان حصہ دوم
(۶) اجزائے ایمان مکمل مجلد
(۷) ایمان اور اسلام
(۸) فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟
(۹) مناہج العرفان فی لفظ القرآن
(۱۰) بلاسود بنکاری (عبوری خاکہ)
(۱۱) منافقت اور اس کی علامات
(۱۲) سیاسی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
(۱۳) معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
(۱۴) اجتہاد اور اس کا دائرہ کار
(۱۵) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور فلسفۂ خودی
(۱۶) تاریخ فقہ میں ہدایہ و صاحب ہدایہ کا مقام
(۱۷) معارف اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم
(۱۸) شہادت توحید
(۱۹) اقبال اور تصور عشق
(۲۰) تحقیق مسائل کا شرعی اسلوب
(۲۱) حکمت استعاذہ (تفسیر اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم)
(۲۲) فلسفۂ تسمیہ (بسم اللہ الرحمن الرحیم)
(۲۳) معارف اسم اللہ جل جلالہ
(۲۴) صفت رحمت کا شانِ امتیاز

(۲۵) عصر حاضر اور فلسفۂ اجتہاد
(۲۶) حصولِ مقصد کی جدوجہد اور نتیجہ خیزی
(۲۷) پیغمبرانہ جدوجہد اور اس کے نتائج
(۲۸) قرآنی فلسفہ تبلیغ
(۲۹) فطرت کا قرآنی تصور
(۳۰) قرآنی فلسفۂ عروج و زوال
(۳۱) پیغمبر انقلاب اور صحیفۂ انقلاب
(۳۲) عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم (وقت کی اہم ضرورت)
(۳۳) Islam In Various Perspectives
(۳۴) Quranic Concept of Human Guidance
(۳۵) Islam and Freedom of Human will
(۳۶) Islamic Concept of Human Nature
(۳۷) Quranic Basis of Constitutional Theory
(۳۸) Philosophy of Ijtihad and the Modern World
(۳۹) Islamic Concept of Crime
(۴۰) Islam-The State Religion
(۴۱) Islamic Philosophy of Punishments
(۴۲) Islamic Concept of Law
(۴۳) Divine Pleasure (The Ultimate Ideal)
(۴۴) Islamic Philosophy of Human Life
(۴۵) Constitutional Structure of an Islamic State (U.P.)

اتفاق اسلامک اکیڈمی ایچ بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور فون ۸۵۴۹۲۲ ❀ ضیاء القرآن پبلی کیشنز گنج بخش روڈ لاہور ۶۳۴۶۴
❖ جامعہ مسجد رحمانیہ ۲۰۵ شادمان لاہور (برموقعہ درس) ❖ ای پلومر۔ شاہراہ قائد اعظم بالمقابل ہائیکورٹ لاہور فون ۵۲۰۹۶
❖ المالک فلیٹس B/6 نزد جہانگیر پارک بالمقابل امپرس مارکیٹ کراچی صدر فون: ۴۳۸۴۸۲

Marfat.com